ISSN - 2582-4619 - VOL 63 - ISSUE 11 - 10 APRIL 2026
TAMEER-E-HAYAT

تعمیرِ حیات لکھنؤ

پندرہ روزہ

علماء کی حقیقی ذمہ داری

''حضرات غور فرمائیں کہ آپ کے فرائض کتنے وسیع اور کس قدر اہم ہیں، صرف گاہے گاہے مسجدوں یا عام جلسوں میں وعظ کہہ دینے یا مدرسوں میں چند طلباء کو درس دے دینے یا نکاح وطلاق کے مسائل بتا دینے سے آپ کے فرائض ادا نہیں ہو سکتے۔ آپ امت محمدیہؐ کے امین بلکہ مخلوقات الٰہیہ کے امانت دار ہیں، اگر یہ مخلوق بے دین ہوئی یا غیروں کی غلامی میں رہ کر یا ذلیل و رسوا ہو کر ہلاک و برباد ہوئی تو یقین مانئے آپ نے فرائض و امانت کو ادا نہیں کیا، نیز اس جہت سے کہ آپ انبیاء کے خلیفہ ہیں، آپ ہی دنیا کے چراغ ہیں، اگر مخلوق الٰہی ضلالت و جہالت اور رسوم و جاہلیت کی تاریکی میں ٹھوکریں کھا کھا کر ہلاک ہوئی تو یقین کیجیے کہ آپ اس کے عند اللہ جواب دہ ہوں گے۔ دین کی نصرت تامہ آپ کے ذمہ قرار دی گئی ہے اور علم کی بدولت اپنی اور مخلوق الٰہی کی زندگی کو خوشگوار بنانے کا فریضہ آپ کے سر عائد کیا گیا ہے۔''

بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ

(مسلمان ایک امت ایک جماعت)

سالانہ زرتعاون ₹500 | ۱۰/اپریل ۲۰۲۶ء | فی شمارہ -/25₹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۳ | ۱۰/اپریل ۲۰۲۶ء مطابق ۲۱/شوال المکرم ۱۴۴۷ھ | شمارہ نمبر ۱۱

اس شمارے میں

تحریک ندوۃ العلماء	مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ	۴
”گاہے گاہے باز خواں...“	محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی	۵
ندوۃ العلماء کا مسلک	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	۷
ندوۃ العلماء کی عصری معنویت	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۸
مشکل گھڑی میں توحید کا سہارا	عبدالرشید راجستھانی ندوی	۱۱
دارالعلوم ندوۃ العلماء- دامن دل می کشد	مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی	۱۲
علم- ہدایت کا ذریعہ یا گمراہی کا ہتھیار	مولانا انیس احمد ندوی	۱۳
لڑکیوں کا ارتداد اور ہماری ذمہ داریاں	محمد ناصر ندوی پرتاپگڑھی	۱۵
عہدِ ظلمت کی بازگشت	ڈاکٹر محمد وثیق ندوی	۱۶
قرآن- تاریخ کا سب سے بڑا معجزہ	ڈاکٹر محمد نصر اللہ ندوی	۱۹
صحبت اللہ والوں کی	محمد کلام الدین ندوی	۲۱
میراث میں عورت کا حصہ مرد سے کم کیوں؟	منور سلطان ندوی	۲۲
یوم الفرقان: چند تربیتی پہلو	ڈاکٹر محمد فرمان ندوی	۲۵
اخلاص- دین کا جوہر اور کامیابی کی شاہ کلید	ڈاکٹر محمد اعظم ندوی	۲۸
دعا- بندگی کا سرِ نہاں	محمد جاوید اختر ندوی	۲۹
تعارف وتبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۳۱
فکری غلامی کے بڑھتے سائے	محمد نفیس خان ندوی	۳۲
سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۳۳

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT

A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)

IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157

State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT

Tagre Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Call : 9559844716

website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔ $100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30 چوجوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعروادب

تحریک ندوۃ العلماء

مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ (۲۵/دسمبر ۱۹۲۵ء-۱۶/فروری ۱۹۸۲ء)

شاد باش اے ندوۂ اصحابِ فکرِ ارجمند
شاد باش اے ندوۂ اصحابِ دل اہل قلم

شاد باش اے ندوہ اہل زباں ہوشمند
شاد باش اے ندوہ اہل قلوب دردمند

کتنے مردِ باخدا تھے، کتنے دانا ہوشمند
درد سے معمور تھے دل اور فطرت ارجمند

جن کے دل میں موجزن تحریک ندوہ کی ہوئی
ڈال کر بنیاد ندوہ کی کیا اس کو بلند

اہل دیں پر چھا رہا تھا اِک تعطل، اِک جمود
اہل باطل بے خطر ان پر لگاتے تھے زقند

ہو گئے بے چین و بے کل دیکھ کر یہ حالِ زار
اہل علم اور اہل دیں اور قوم کے کچھ دردمند

متفق ہو کر بنایا اہل حق نے اِک نظام
تا کہ پھر اسلام پر حملوں کا دروازہ ہو بند

چند اہل درد نے تحریک ندوہ پیش کی
کہ یہی تحریک ملت کے لیے تھی سودمند

ان کی نیت نیک تھی اور خوب تھا ان کا عمل
اس لیے اللہ کو ان کا عمل آیا پسند

شیخ کامل حضرت امداد، تاج اولیاء
جن کے دامن سے ہی وابستہ ہے سارا دیوبند

آپ نے تائید فرمائی تھی اس تحریک کی
آپ کی تائید کا ندوہ بہت احسان مند

چل پڑی تحریک یہ پھر آگ پانی کی طرح
اہل حق ہونے لگے ہر ہر قدم پر فتح مند

ہر قدم ملتے رہے تحریک کو وہ رہنما
تھے یقیں محکم، سراپا درد مند و فکر مند

شبلیؔ نعمانیؔ، مونگیریؔ، شیروانیؔ، عبدحیؔ
ان میں ہر ہر ایک کا تھا مرتبہ کتنا بلند

آسمانِ علم میں سب نے لگائے چار چاند
علم ظاہر ہو کہ باطن کر دیا سب کو دو چند

آج تک سید سلیمانؔ کی دلوں میں یاد ہے
صاحب قلب و نظر تھے اور زباں ہوشمند

درس گاہِ ندوہ کہتے ہیں جسے دارالعلوم
علم کے معیار کو کتنا کیا اس نے بلند

کیا ادب، تاریخ کیا اور کیا سلوک و معرفت
جس کی چاہو اس ادارہ سے ملے گی تم کو قند

میں بتاتا ہوں تمہیں اس دور میں ندوہ ہے کیا
ایک قلبِ دردمند اور ایک فکرِ ارجمند

اس ادارہ پر ہے اب اللہ کی نظر کرم
اس لیے اس کو کوئی پہنچا نہیں سکتا گزند

اداریہ

”گاہے گاہے باز خواں ....“

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

رمضان، اس مہمان کی طرح ہے جو آتا ہے تو سوغاتوں کے ساتھ اور جاتا ہے تو بھی انعامات کے ساتھ۔ ان انعامات میں سب سے بڑھ کر قرآن کریم ہے۔ اگر یہ انعام نہ ہوتا تو شاید مسلمانوں کے لیے لکھنے پڑھنے کے عمل کو فرض بھی نہیں قرار دیا جاتا۔ الکتاب، القرآن، القلم کی اکائیاں اور 'تعلمون' و 'تدرسون' کے افعال کی گردانوں نے صاف اعلان کر دیا کہ الکتاب کے آنے کے بعد علم کی بے کراں کائنات کا باب الداخلہ یہی قرآن ہوگا۔ جہل کے ظلمات کو 'لیلۃ القدر' میں بدلنے اور علم کے مطلع الفجر تک پہنچنے کا اشارہ بجز قرآنِ کریم کے اور کیا ہے؟؟!!۔ یہ ربانی تحفہ صرف مسلمانوں ہی نہیں، تمام انسانوں کے ذوقِ علم کی کامل تسکین کا سب سے بڑا ذریعہ بنا دیا گیا، اتنا بڑا کہ یہ نسلِ انسانی کی میراث قرار پایا: ”ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا“ کی حقیقت کو قیامت تک بدلا ہی نہیں جا سکتا۔

یہاں ان چند اشاروں کا مقصد رمضان کے معاً بعد علومِ دینیہ کی بہاروں کے موسم کے آغاز میں نہاں مقصد کو عیاں دیکھنا ہے۔ دینی مدارس کے علم و حکمت کے سرچشموں کی نئی اور تازہ روانی اس کے علاوہ اور کیا مقصد رکھتی ہے کہ رمضان کے سب سے بڑے تحفہ الکتاب اور القرآن کے علوم کی وراثت کو اصل اور حقدار وارثوں میں تقسیم کرنے کے عمل کی ابتدا، رمضان کی قربت زمانی کی تازگی رکھتی ہو۔

ندوۃ العلماء اور اس کا دار العلوم ظاہر ہے اسی موسمِ بہار کی بادِ صبا سے ہم کنار ہے۔ ندوہ کا نام زبان پر آتا ہے تو دل بے اختیار ماضی کی یادوں کو آواز دینے لگتا ہے۔ دیکھا جائے تو ان یادوں کو کسی نہ کسی طرح زندہ رکھنا ہی چاہیے، تاکہ ندوہ کا اصل مقصد یا اس کے بنیادی مقاصد پر وقت کی گرد ایسی نہ جمے کہ اصل چہرہ ہی دھندلا ہو جائے۔

اپنے وقت، بلکہ ندوہ کی تاریخ میں سب سے نمایاں اور اس کے اولین ثمر کی حیثیت رکھنے والے علامہ سید سلیمان ندوی نے ندوہ کا ذکر کیا تو سرخی یہی دی کہ: ”ندوۃ العلماء یعنی علماء کی مذہبی و تعلیمی اصلاح کی تحریک“۔ یہ چند الفاظ پوری طرح ندوہ کی روح کے ترجمان بن جاتے، کہ علماء کی تحریک جس کا مقصد مذہب و تعلیم میں امکاناتِ فساد یا بگاڑ کی ممکنہ صورتوں کی پہچان، ان کی نشاندہی اور پھر ان کی اصل غرض و غایت کے لیے فساد اور بگاڑ کو درست اور صحیح کرنے کی کوششیں۔ اس سرخی میں مذہب اور تعلیم دونوں کی موجودگی دراصل ندوہ اور اس کے بانیوں کی روح کی آواز ہے کہ تعلیم کے بغیر مذہب کی افادیت ادھوری ہے۔ اسی لیے سید صاحبؒ کی نظروں نے اس نکتہ کو پالیا کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خانوادہ کی علمی و تعلیمی روایات اور مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ کی بنیادوں کو استحکام بخشا۔ سید صاحب کے الفاظ میں مشرق و مغرب کے یہی دونوں مطلع تھے جن سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع ہوا۔

ندوۃ العلماء کے قیام کے محرکات اور اس وقت کی مذہبی و تعلیمی حالات کو ہر تعلیمی سالِ نو کے موقع پر نظر میں رکھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ گرچہ وقت کی رفتار نے زمان و مکان کے تغیر احوال میں کوئی کمی نہیں کی، تاہم بنیادی ضرورتیں اور تقاضے، ماضی و حال کے فاصلوں میں زیادہ دوری اور تبدیلی کا احساس نہیں ہونے دیتے۔

ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم کے باب میں یہ حقیقت بڑی اہم ہے کہ ندوۃ العلماء کا مقصد ہندوستان کے عربی مدارس اور ان کے مروجہ نصاب میں ضروری تبدیلیوں کے ذریعہ اصلاح کی جائے۔ اس نیک نیت مقصد میں مطلوب کامیابی نہ ملنے کی وجہ سے اپنے مجوزہ طریقۂ تعلیم کو نمونہ بنانے کے لیے دارالعلوم کے قیام کی ضرورت ناگزیر ہوئی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جن ذرائع پر عمل کیا، اس کے کامیاب نتائج کی تفصیل، ہندوستان کی گذشتہ صدی کے مسلمانوں کی تاریخ کا حصہ ہے۔ دارالعلوم کے طریق و نصابِ تعلیم کی کامیابی اسی سے ظاہر ہے کہ اس کو ان علماء کی ہم نوائی کی مسرت نصیب ہوئی جو شروع میں بدظن اور مذبذب تھے۔ 'حیاتِ شبلی' میں لاہور میں جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کی تائید سے ایک تجویز منظور ہوئی جو عین ندوہ کے مقاصد کا آئینہ تھی۔ اس تجویز کو دیکھ کر مولانا سید سلیمان ندویؒ کا یہ جملہ بہرحال پڑھنے کے لائق ہے کہ: ''لیجیے وہی چیز جو کبھی موردِ اعتراض تھی، اتنے دنوں میں جا کر موردِ تحسین بنی، و للہ الحمد''۔

ندوہ کے کوچہائے علم کے تازہ واردان کو بہرحال اس تاریخِ ندوہ سے واقف ہونا چاہیے، جہاں مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے استاد کو یاد کر کے کہتے ہیں کہ وہ تمام قومی اور علمی تحریکوں کے بانی تھے۔ امام الہند حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم و ملت کے لیے وقف تھا، وہ ہندوستان کو آخر زمانہ میں خادمِ ملت کی حیثیت سے عطا کیے گئے، وہ آئے اور آقائے اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی خدمت کی اور آخر اسی خدمت میں جان دی، اور دی تو اس طرح کے نامِ اقدس زبان پر تھا۔ ندوہ کے کتب خانہ کو علامہ شبلیؒ کے نام سے موسوم کرتے ہوئے سید صاحبؒ نے کہا تھا کہ: یہ کتب خانہ علامہ شبلیؒ کی روح کا مسکن ہے۔ اور دارالعلوم کی کامیابی اور اس کے فرزندوں کی وسیع نظری، استغنائے علمی اور شوقِ مطالعہ اسی کتب خانہ کا نتیجہ ہے۔ ندوہ کی تاریخ میں خدا جانے کیا کیا پوشیدہ ہے۔ یہی مولانا شبلیؒ جنھوں نے مولانا عبدالحی حسنیؒ کے بارہ میں لکھا کہ وہ ایک مدت سے ندوۃ العلماء میں مددگارِ ناظم کی خدمت پر مامور ہیں، اور انھوں نے نہایت خوبی سے اس خدمت کو آج تک انجام دیا، عرصہ سے انھوں نے معاوضہ لینے سے بالکل انکار کر دیا، اور اب بغیر کسی حق الخدمت کے اپنے کام کو اسی مستعدی، سرگرمی اور دلسوزی سے انجام دے رہے۔ یہ فیاضی اس وقت اور بھی قابلِ قدر ہو جاتی ہے جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو معاش کی طرف سے بے اطمینانی ہے، اور اس وجہ سے ان کی زندگی نہایت عسرت کے ساتھ بسر ہوتی ہے؛ لیکن ان کی اس عسرت پر سینکڑوں امیرانہ زندگیاں نثار کر دینے کے قابل ہیں۔

ندوہ کی تاریخ صرف ایک ادارہ کی تاریخ نہیں؛ بلکہ حقیقت میں یہ تاریخِ دعوت ہے اور تاریخِ عزیمت بھی۔ ندوہ کے در و دیوار پر نقش اس تاریخ کو چشمِ بینا سے دیکھنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح کتابوں اور استادوں کی تحریروں اور جلوؤں کو دیکھنا ادب و تعظیم کے قرینوں میں ہے۔

☆☆☆

مشعل راہ

ندوۃ العلماء کا مسلک

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

دین وعقائد کے معاملہ میں ندوۃ العلماء کے مسلک کی بنیاد دین خالص پر ہے جو ہر قسم کی آمیزش اور آلائش سے پاک، تاویل اور تحریف سے بلند، ملاوٹ اور فریب کی دسترس سے دور اور ہر اعتبار سے مکمل اور محفوظ ہے۔

دین کے فہم اور اس کی تشریح اور تعبیر میں اس کی بنیاد اسلام کے اولین اور صاف وشفاف سرچشموں سے استفادہ اور اس کی اصل کی طرف رجوع پر ہے۔

اعمال واخلاق کے شعبہ میں دین کے جوہر ومغز کو اختیار کرنے، اس پر مضبوطی سے قائم رہنے، احکام شرعیہ پر عمل، حقیقتِ دین اور روحِ دین سے زیادہ قربت تقوی اور صلاح باطن پر ہے۔

تصور تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا دور اول سب سے بہتر اور قابل احترام دور، اور وہ نسل جس نے آغوش نبوت صلی اللہ علیہ وسلم اور درسگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں تربیت پائی اور قرآن وایمان کے مدرسہ سے تیار ہو کر نکلی سب سے زیادہ مثالی اور قابل تقلید نسل ہے اور ہماری سعادت ونجات اور فلاح وکامرانی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کریں اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

نظریۂ علم اور فلسفۂ تعلیم میں اس کی اساس اس پر ہے کہ علم بذات خود ایک اکائی ہے جو قدیم وجدید اور مشرق ومغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کی جاسکتی اگر اس کی کوئی تقسیم ممکن ہے تو وہ تقسیم صحیح اور غلط، مفید اور مضر اور ذرائع اور مقاصد کے اعتبار سے ہوگی۔

استفادہ اور افادہ اور ترک وقبول کے شعبہ میں اس کا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ: "**الحكمة ضالة المؤمن حيث وجدها فهو أحق بها**" (حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا مستحق ہے)، نیز قدیم حکیمانہ اسلوب: "**خذ ما صفا ودع ما كدر**" یعنی جو صاف ونظیف ہو اس کو لے لو اور جو آلودہ اور کثیف ہو اس کو چھوڑ دو۔

اسلام کے دفاع اور عصر حاضر کی لادینی قوتوں کے مقابلہ میں اس کی اساس اس ارشاد ربانی پر ہے: "**وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة**" [الأنفال] یعنی ان کے مقابلہ کے لیے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے تیاری کرو۔

دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن وفضائل کی تشریح اور ذہن وعقل کو اس کی حقانیت وصداقت پر مطمئن کرنے میں اس کا عمل اس حکیمانہ وصیت پر ہے کہ: "**كلّموا الناس على قدر عقولهم، أتريدون أن يكذب الله ورسوله**" یعنی لوگوں سے ان کے عقلوں کا خیال رکھتے ہوئے گفتگو کرو کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا دیا جائے۔

عقائد واصول میں وہ جمہور اہل سنت کے مسلک کی پابندی اور سلف کے آراء وتحقیقات کے دائرہ میں محدود رہنا ضروری سمجھتا ہے فروعی اور فقہی مسائل کے بارے میں اس کا مسلک واصول یہ ہے کہ حتی الامکان اختلافی مسائل کو چھیڑنے اور ہر ایسے طرز عمل سے احتراز کیا جائے جس سے باہمی منافرت بڑھے اور امت کا شیرازہ منتشر ہو، سلف صالحین سے حسن ظن رکھا جائے اور ان کے لیے عذر تلاش کیا جائے، اسلام کی مصلحت اجتماعی کو ہر مصلحت پر ترجیح دی جائے۔

مختصر یہ کہ وہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (متوفی ۱۱۷۶ھ) کے علمی وفکری اور کلامی وفقہی مدرسۂ فکر سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے اس لحاظ سے ندوۃ العلماء ایک محدود تعلیمی مرکز سے زیادہ ایک جامع اور کثیر المقاصد دبستان فکر اور مکتب خیال ہے۔

☆☆☆

چشم کشا

ندوۃ العلماء کی عصری معنویت

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء)

اسلام کی ترجمانی اور اس کی حقیقت کو عالم کے سامنے پیش کرنے اور دلوں تک پہنچانے کے لیے جو ادارے قائم ہوئے ان میں ندوۃ العلماء کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک بڑا شرف عطا فرمایا ہے۔ اس کا جو اصل بنیادی مقصد تھا وہ اس آیت کی ترجمانی تھی جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مدارس کے مقصد کو واضح کیا ہے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ فرماتے تھے: میں غور کرتا ہوں کہ کیا قرآن مجید میں کہیں مدرسہ کا تذکرہ ہے؟ جب یہ آیت میرے سامنے آتی ہے تو صاف لگتا ہے کہ اس آیت میں مدرسہ کا تذکرہ ہے۔ وہ آیت اکثر اسانید کے لوح پر لکھی بھی جاتی ہے:

"فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ"۔

(تو کیوں نہ ہر طبقہ میں سے ایک جماعت نکل پڑے تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرے اور تاکہ اپنی قوم کو جب ان کے پاس وہ واپس آئے تو خبردار کرے شاید وہ باز رہیں)۔

ندوۃ العلماء کا جو اصل امتیاز ہے وہ "تفقہ فی الدین" کے ساتھ "انذارِ قوم" کا ہے۔ عام طور پر پہلے جو مدارس تھے ان کے یہاں تفقہ فی الدین کی اہمیت تھی اور یہ بہت بنیادی چیز ہے، اگر تفقہ فی الدین نہ ہو اور دین کی سمجھ نہ ہو اور پھر آدمی پہنچانے والی یا تبلیغ یا انذار کی کی کوئی بات کرتا ہے تو ہوسکتا ہے وہ کہیں ٹھوکر کھا جائے۔ اس لیے تفقہ فی الدین کی بڑی اہمیت ہے اور وہ بنیاد ہے۔ اس زمانہ میں ایسے مدارس موجود تھے جن میں الحمد للہ تفقہ فی الدین تھا، لیکن اس آیت کا جو دوسرا اہم جزء ہے، جو میں سمجھتا ہوں کہ خاص طور سے طبقہ علماء کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کی وراثت ہے، وہ "انذار قوم" کی ہے۔

ندوۃ العلماء کے قیام کے جو بنیادی مقاصد تھے اس میں ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ ایسے افراد تیار کیے جائیں جو ہر طبقے تک صحیح بات پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ شروع کے تقریباً سات آٹھ سال ایسے گذرے کہ ندوہ صرف ایک تحریک تھا اور اس کا کوئی دار العلوم یا مدرسہ نہیں تھا، لیکن اس مدت میں یہ تجربہ ہوا کہ جب تک ایک ایسا دار العلوم قائم نہیں کیا جاتا جس میں افراد تیار کیے جائیں، اس وقت تک دوسروں کو مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس فکر کے مطابق افراد تیار کریں جو ملت اسلامیہ کے کام آسکیں اور ان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔ اس کے لیے دار العلوم کا قیام عمل میں آیا اور الحمد للہ دار العلوم کے اس قیام کا بڑا فائدہ سامنے آیا، اللہ کا فضل ہے کہ ایسے افراد تیار ہوئے جن کو اللہ نے تفقہ فی الدین کی صلاحیت بھی دی اور اللہ نے ان کو انذار کی اور بات پہنچانے کی صلاحیت بھی دی۔ اس سلسلہ میں تین باتیں کہی جاتی ہیں: فکر ارجمند، زبان ہوش مند اور دل دردمند۔ واقعہ یہ ہے کہ الحمد للہ ندوۃ العلماء میں یہ تینوں چیزیں پائی جاتی ہیں: فکر ارجمند بھی ہے، زبان ہوش مند بھی ہے اور دل دردمند بھی ہے اور یہ تینوں باتیں ندوہ کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

ندوہ کی دو نمایاں ہستیاں

دار العلوم جب قائم ہوا تو اس کے ذریعہ سب سے پہلی نمایاں شخصیت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سامنے آئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو جو جامعیت عطا فرمائی، ہندوستان میں ایسی جامع صفات شخصیت ملنا اس قریبی دور میں تو شاید بہت مشکل ہے۔ اللہ نے ان کو علم کی گہرائی عطا فرمائی۔ آپ ہندوستان کی قریبی تاریخ میں دیکھئے تو بڑے بڑے مفسرین ومحدثین ہیں، بڑے بڑے فقہاء اور مؤرخین ہیں لیکن اگر آپ ایک شخصیت میں ان ساری صفات کو دیکھنا چاہیں تو شاید علامہ سید سلیمان ندویؒ کے علاوہ آپ کو دوسری شخصیت ملنا مشکل ہے۔ آپ کو بڑے سے بڑے محدث مل جائیں گے جن کی حدیث پر بڑی گہری نگاہ ہے، بڑے بڑے جو ادارے ہیں، جنہوں نے یقیناً بڑی بڑی شخصیتیں پیدا کی ہیں، وہ ہمارے لیے سرمایہ افتخار ہیں اور ہم ایک لمحہ کے لیے بھی ان کی افادیت سے انکار نہیں کرسکتے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے سید صاحبؒ کو علوم کی جو جامعیت عطا فرمائی اور ان کو جو معتدل مزاج اور اسلامی اخلاق کی جو بلندی دی وہ ان کا امتیاز ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے یہاں گئے تو تھوڑی ہی مدت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو وہ مقام عطا فرمایا، جس پر بعض لوگوں کو اعتراض بھی ہوا تو حضرت تھانویؒ نے فرمایا: میں کیا کروں؟ لکڑی بالکل خشک تھی، ذرا سی آگ لگی اور وہ بھڑکنے لگی۔ ظاہر ہے وہ عشق الٰہی کی آگ تھی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں لگائی۔

حضرت سید صاحبؒ فرماتے تھے کہ لوگ کہتے ہیں میں بڑا عقل مند ہوں، بڑا صاحب ہوش ہوں اور پھر اعتراض بھی کرتے ہیں کہ میں حضرت تھانویؒ کے پاس کیوں گیا، جب لوگ مجھے عقل مند سمجھتے ہی ہیں تو پھر اعتراض کس بات کا ہے؟ اللہ نے ندوۃ العلماء میں ان تمام چیزوں کو جمع فرمایا اور سب سے پہلی شخصیت جو ندوۃ العلماء کی فکر اور اس کا جو مزاج تھا اس مزاج کے بالکل مطابق پوری ترجمانی کے ساتھ ڈھل کر سامنے آئی وہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت ہے۔

دوسری شخصیت جو دوسری نسل سے تعلق رکھتی ہے وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ہے، جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جامعیت عطا فرمائی اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو فکر کی ایسی بلندی اور ایسی دل سوزی ودردمندی دی کہ پورے عالم اسلام میں کیا بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی اللہ نے ان سے دین کی اشاعت کا غیر معمولی کام لیا اور انہوں نے دین کی صحیح فکر کو اچھی طرح پیش کیا۔ ان کی کتاب **"ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین"** کو ایک ایسا مقام ملا جو میں سمجھتا ہوں کہ اس صدی کی چند نمایاں ترین کتابوں میں اس کتاب کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ حضرت مولاناؒ خود سناتے تھے کہ ایک مرتبہ بڑا لطیفہ ہوا، وہ مصر میں تھے اور کچھ طلبہ جامعہ ازہر کے ملنے کے لیے آئے، مولانا نے پوچھا: کیا آپ نے "ماذا خسر" پڑھی ہے؟ ان میں بعضوں نے کہا کہ نہیں پڑھی ہے۔ حضرت مولانا کہتے ہیں: ہماری زبان سے عجیب جملہ نکل گیا جس پر بڑی شرمندگی ہوئی کہ جس نے "ماذا خسر" نہیں پڑھی وہ پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن اتفاق سے شام کو شیخ یوسف القرضاویؒ ملنے آئے، جو اس زمانہ میں وہیں طالب علم تھے اور انہوں نے آکر برجستہ حضرت مولانا سے کہا کہ ہمارے یہاں مشہور ہے جس نے "ماذا خسر" نہیں پڑھی وہ پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا۔ حضرت مولانا کہنے لگے تب مجھے اطمینان ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کی یہ وہ شخصیات ہیں جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑے کام لیے اور یہ حضرات ندوۃ العلماء کے ترجمان بنے۔

میں خاص طور سے یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تفقہ فی الدین کیا چیز ہے؟ اس سے مراد فقیہ بننا نہیں ہے بلکہ دین کا صحیح مزاج شناس بن جانا، دین کا صحیح فہم حاصل ہونا تفقہ فی الدین ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان حضرات کو خاص طور سے عطا کیا پھر اللہ نے ان کو یہ توفیق دی کہ سارے عالم میں دین کی صحیح فکر عام کرنے کے لیے انہوں نے کتابیں لکھیں، تقریریں بھی کیں، اسفار بھی کیے اور محنت بھی کی اور الحمدللہ اپنے اپنے دور میں ان کے غیر معمولی کارنامے ہیں جن کو یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں، مگر ظاہر ہے یہ سب ندوۃ العلماء کی ہی فکر کا نتیجہ ہے۔

ندوۃ العلماء، کی معتدل ومتوازن فکر

ندوۃ العلماء کی فکر معتدل اور متوازن فکر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے اس دور میں جب کہ دنیا ایسے حالات سے گزر رہی ہے جو بعض مرتبہ انتہائی خطرناک معلوم ہوتے ہیں، لگتا ہے کہ نہ جانے کیا ہوگا؟ آج انسانوں کو اپنی حقیقت یاد نہیں، انسانوں کے اندر انسانیت ختم ہوگئی، انسان کا اصل امتیاز کیا ہے اور مسلمانوں کا اصل امتیاز کیا ہے؟ سب سے بڑھ کر میں کہتا ہوں کہ علماء کا امتیاز کیا ہے؟ آج یہ باتیں فراموش ہورہی ہیں۔ ایسے حالات میں ندوۃ العلماء نے جو معتدل فکر پیش کی ہے اور اس کے اندر جو وسعت اختیار کی ہے، اس کی سب سے بڑھ کر ضرورت ہے۔

"رفع نزاع باہمی" ندوۃ العلماء کے قیام کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا، آپ جانتے ہیں کہ اس کا جو پہلا اجلاس کانپور میں منعقد ہوا اس میں مولانا احمد رضا خاں بھی شریک ہوئے اور بعض دوسرے فرقے کے لوگ بھی شریک ہوئے جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ گمراہی کی طرف جارہے ہیں لیکن ان کو قریب کرنے کے لیے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو ان کی ہدایت کا ذریعہ بنادے، انہیں شریک کیا گیا لیکن بعد میں وہ الگ ہوئے اور عجیب بات ہے کہ ندوہ کے رد میں انہوں نے نہ جانے کتنی کتابیں لکھ ڈالیں، لیکن ندوہ کی اصل فکر یہ تھی کہ ہر طبقہ کے لوگوں کو قریب کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس زمانہ میں بہت سے ایسے لوگ جو دوسری سمت کی طرف جارہے تھے اور بعض مرتبہ بڑے اختلافات نظر آرہے تھے ان میں آپس میں محبتیں پیدا ہوئیں اور لوگ بغل گیر ہوئے۔ ندوہ کے اجلاس میں ایسے متعدد واقعات ہیں جو تاریخ میں موجود ہیں۔

یہ بھی ندوہ کا مقصد تھا کہ معمولی چیزوں کو وجہ نزاع نہ بنایا جائے، یہ جو مسلکی اختلافات ہیں، ان کے متعلق ندوۃ العلماء نے یہ بات کہی کہ ان اختلافات کی کوئی بنیادی حیثیت نہیں، جو اہل حق ہیں وہ سب اہل حق ہیں، چاہے وہ کسی مسلک سے تعلق رکھتے ہوں اور پھر یہ کہ جو وسائل ہیں، وہ بدلتے رہتے ہیں اور نئے نئے وسائل ہمارے سامنے آتے ہیں، اس لیے فروعات اور وسائل میں ہمیں اختیار ہے، ہمیں ان کے اندر وسعت اختیار کرنی چاہیے اور یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہم سب کو ساتھ لے کر چلیں۔

ندوۃ العلماء کا یہ بنیادی مسلک رہا ہے کہ اس

نے اصول وعقائد میں پورے تصلب کے ساتھ سلف سے انحراف کرنا کبھی گوارا نہیں کیا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے جو دس بنیادی اصول لکھے اس میں صراحت کے ساتھ یہ بات لکھی کہ ہم سلف کے منہج سے کبھی ہٹ نہیں سکتے، اگر ہٹ گئے تو یہ ندوۃ العلماء کی فکر سے انحراف ہوگا۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ بھی بار بار یہ بات کہتے تھے اور کئی جگہ یہ بات لکھی ہے کہ کبھی بھی جمہور کے مسلک سے مت ہٹنا، اس لیے کہ اس سے آدمی کے اندر انحراف پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ چیزیں اگر آپ دیکھیں تو زیادہ سے زیادہ علمی مباحث کے لیے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ یہ مسالک حقیقت میں تبلیغ کے لیے نہیں ہوتے بلکہ ترجیح کے لیے ہوتے ہیں، تبلیغ کے لیے تو اسلام ہے، اس لیے ہم اسلام کی صحیح ترجمانی کریں، اسلام کا پورا ڈھانچہ پیش کرنے کی کوشش کریں، عقائد سے لے کر عبادات تک، معاملات ومعاشرت اور اس کی جو اخلاقی زندگی ہے، اس کو پیش کرنے کی ہماری اصل بنیادی ذمہ داری ہے کہ ہم اس کو اپنا اصل دعوت کا مقصد بنائیں۔

میں یہ بات بھی عرض کرتا ہوں کہ یہ ادارے حقیقت میں ذرائع کا درجہ رکھتے ہیں، یہ مقاصد نہیں ہیں۔ آج ہم سے بہت بڑی بھول یہ ہوتی ہے اور بعض مرتبہ بڑوں سے بھی یہ غلطی ہوسکتی ہے کہ وہ اداروں کو مقصد بنا کر آگے بڑھتے ہیں جس کے نتیجہ میں انتشار بڑھتا ہے۔ ہمارے لیے سب سے بڑھ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں اور ہمارے وہ سلف ہیں جنہوں نے اسلام کی صحیح ترجمانی کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب کیا، ایسے اہل حق ہمیشہ رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے قیامت تک، انہی کے راستے پر چلنا اور انہی کے راستے پر رہنا ہمارا اصل مقصد ہے اور یہ ادارے قائم ہی دین کی صحیح ترجمانی کے لیے ہوتے ہیں۔

ندوۃ العلماء کو جو خاص طور سے قائم کیا گیا وہ اسی لیے قائم کیا گیا کہ اصول اور عقائد میں پورے تصلب کے ساتھ ہم فروعات میں وسعت کو اختیار کریں اور جو نئے نئے وسائل ہمارے سامنے آرہے ہیں ان وسائل کو اختیار کریں اور دین کی صحیح ترجمانی کرسکیں۔ ندوۃ العلماء کا یہ اصل مقصد ہے۔

عالمی حالات میں فکرِ ندوہ کی اہمیت ومعنویت

اس وقت ساری دنیا کو ضرورت ہے کہ یہ فکر لوگوں کے سامنے رکھی جائے، لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی ہم عقیدہ میں انحراف اختیار نہیں کرسکتے۔ یہ دور سوشل میڈیا کے ذریعہ سے لوگوں کو ہر طرح کی اپنی بات کہنے کا دور ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے وہ لوگ جو اچھے طریقے پر بات کرسکتے ہیں، ہمارے آس پاس جو مسلمان ملک ہیں وہاں بھی اور دوسرے ممالک میں بھی ایسے لوگ ہیں جو بعض مرتبہ لوگوں کے انحراف کا ذریعہ بنتے ہیں، اس لیے کہ لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کو اچھے انداز سے اپنی بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے، اب اگر خدانخواستہ ہم نے ان کی حقیقت نہ سمجھی اور ہم منزل سے دور ہوئے تو یہ ہمارے لیے بڑے خطرہ کی بات ہے۔ میں نے کئی جگہ یہ بات عرض کی کہ دیکھئے سڑک بڑی اچھی ہے لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ آپ کی منزل کیا ہے؟ کیا سڑک اچھی ہے تو آپ آگے بڑھتے چلے جائیں گے چاہے منزل سے دور ہوتے چلے جائیں؟ ہمیں تو اپنی منزل دیکھنی ہے، اگر سڑک خراب ہے تو بھی ہمیں اپنی منزل تک جانا ہے۔ یہ مقاصد ہمارے سامنے رہنے چاہئیں۔

ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں ''وسعت فکری'' کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم آگے بڑھتے چلے جائیں، یہاں تک کہ انحراف کا شکار ہوجائیں بلکہ تحریف تک پہنچ جائیں یا گمراہی کا شکار ہوجائیں۔ ندوۃ العلماء ہرگز اس دعوت کے لیے قائم نہیں ہوا تھا۔ ندوۃ العلماء اس لیے قائم ہوا تھا کہ جمہور کا جو مسلک اور ان کی جو رائے ہے اور اہل حق کا جو مسلک ہے' اس میں پورے تصلب کے ساتھ جو فروعات اور مسلکی اختلافات ہیں ان میں ہمیں توسع اختیار کرنا ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ ندوۃ العلماء کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں، وہاں طلبہ آتے ہیں اور تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ندوۃ العلماء کے جو ذمہ داران ہیں انہوں نے ہمیشہ اس فکر کو پیش کیا۔

ہمیں وسائل وذرائع کو بھی اختیار کرنا ہے، جو جائز چیزیں ہیں اور جو نئی نئی چیزیں ہمارے سامنے آرہی ہیں، ہم ان کی تحقیق کریں اور ان کو اختیار کریں اور پھر جو ہمارا اصل مقصد ''انذار قوم'' اور لوگوں تک صحیح بات پہنچانے کا ہے، اس کے لیے ہم اپنی زندگی بھی ایسی بنائیں کہ ہماری زندگی سے لوگوں کو نفع پہنچے اور ہمارے اخلاق سے لوگوں کو ایک نمونہ ملے اور ہمارے اس معتدل مزاج سے لوگوں کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچے۔ بعض مرتبہ ہوسکتا ہے کہ ہمیں بات کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑے لیکن ہماری جو ایک معتدل زندگی ہے اور بلند اخلاق رکھنے والی زندگی ہے اور لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے والا جو ہمارا مزاج ہے، اس مزاج سے لوگوں کو نفع پہنچے۔ یہ بھی ہمیں اختیار کرنا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو بھی صلاحیت دی ہو اس صلاحیت کا بھی استعمال کرنا ہے۔

☆☆☆

تعلیم الحدیث

مشکل گھڑی میں توحید کا سہارا

مولانا عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رضي الله عنه، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: "دَعْوَةُ ذِي النُّونِ إِذْ دَعَا وَهُوَ فِي بَطْنِ الْحُوتِ: لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، سُبْحَانَكَ، إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ؛ فَإِنَّهُ لَمْ يَدْعُ بِهَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ فِي شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا اسْتَجَابَ اللهُ لَهُ" (الترمذی، رقم: ۳۵۰۵)

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ذوالنون، یعنی حضرت یونس علیہ السلام کی وہ دعا جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں کی تھی: لا إله إلا أنت، سبحانك، إني كنت من الظالمين کوئی مسلمان جب بھی کسی معاملے میں یہ دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتے ہیں۔

تشریح: یہ حدیث مختصر ہے، مگر اس کے اندر بندگی، دعا، توبہ، توحید اور نجات کے بڑے عظیم مضامین جمع ہو گئے ہیں۔ انسان کو زندگی میں بہت سے سہارے دکھائی دیتے ہیں، لیکن جب حالات تنگ ہو جائیں، راستے بند ہو جائیں، دل گھبرا جائے اور تدبیریں جواب دے جائیں، تب معلوم ہوتا ہے کہ اصل سہارا صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں میں سب سے نمایاں رنگ توحید کا ہوتا ہے۔ وہ مصیبت کے وقت سب سے پہلے اپنے رب کی وحدانیت کا اعلان کرتے ہیں، پھر اسی کے سامنے جھکتے ہیں اور پھر اسی سے فریاد کرتے ہیں۔

حضرت یونسؑ کا واقعہ اسی حقیقت کی روشن تفسیر ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ، فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِينَ"۔ [الأنبياء: ۸۷-۸۸]

یعنی انہوں نے تاریکیوں کے اندر پکارا: تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بے شک میں ہی قصورواروں میں سے تھا؛ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے ان کی دعا قبول کی، انہیں غم سے نجات دی، اور اسی طرح ہم اہلِ ایمان کو نجات دیتے ہیں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ یہ صرف ایک نبی کا واقعہ نہیں، بلکہ ایمان والوں کے لیے ایک دائمی اصول ہے: توحید کے ساتھ کی گئی عاجزانہ پکار نجات کا دروازہ کھولتی ہے۔

اس دعا کے تین حصے ہیں، اور یہی اس کی روح ہے:

"لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ" میں خالص توحید ہے۔

"سُبْحَانَكَ" میں اللہ تعالیٰ کی تنزیہ ہے۔

"إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ" میں اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے۔

یہ انبیاء کا طریقہ ہے کہ مصیبت میں دوسروں پر الزام نہیں رکھتے، بلکہ پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرتے ہیں۔ جب بندہ اپنی کوتاہی مان لیتا ہے، تب رحمت کے دروازے کھلتے ہیں۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے صرف یہ نہیں فرمایا کہ یہ حضرت یونس علیہ السلام کی دعا تھی، بلکہ عمومی بشارت دی کہ کوئی مسلمان کسی معاملے میں یہ دعا کرے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتے ہیں۔

اس سے بندے کو یہ رہنمائی ملتی ہے کہ بیماری، مالی تنگی، گھریلو پریشانی، اولاد کا غم، ذہنی گھٹن، خوف اور اضطراب، جو بھی معاملہ ہو اگر بندہ اس دعا کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو تو اس کی پریشانی بھی دور ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب بھی نصیب ہوتا ہے۔

اسی مضمون کو نبی کریم ﷺ کی ایک اور دعا مزید واضح کرتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کرب اور شدید پریشانی کے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

"لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ الْعَظِيمُ الْحَلِيمُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَرَبُّ الْأَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ"۔ (البخاری، رقم: ۶۳۴۵)

غور کیجیے کہ یہاں بھی سب سے پہلے توحید کا ذکر ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی عظمت، حلم اور ربوبیت بیان کی گئی ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا کی قبولیت صرف الفاظ سے نہیں بلکہ دل کی کیفیت سے وابستہ ہے۔ اگر بندہ سچے دل سے اللہ کی طرف رجوع کرے، اپنی کوتاہی مانے اور توحید کا اقرار کرے تو یہی مختصر دعا عظیم نتائج پیدا کرتی ہے۔

لوگ مشکل آتے ہی کبھی نجومیوں کی طرف، کبھی باطل تعویذ گنڈوں کی طرف، کبھی غیر اللہ سے امیدیں باندھنے کی طرف، اور کبھی بے صبری و شکوہ کی طرف بھاگتے ہیں۔ حالانکہ نبیوں کا راستہ یہ ہے کہ بندہ سب سے پہلے اپنے رب کے سامنے جھکے۔ توحید کا تقاضا یہ ہے کہ مصیبت میں بندہ اسی ایک اللہ کی طرف جھکے۔

☆☆☆

فکرونظر

دارالعلوم ندوۃ العلماء
دامن دل می کشد

مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی

دین وشریعت کا ایک ایسا آسمان ہے جس کے سیارے اورثوابت ہرسواپنی تابانی بکھیر رہے ہیں۔

نورِالٰہی کا ایک ایسا خورشید درخشاں ہے جس کی ضوفشانی ہرکہ ومہ کوروشن کیے ہوئے ہے۔

ایمان وعقیدے کا ایک ایسا حصن حصین ہے جس کی فصیلیں نیت واعمال کے سنگ ہائے گراں سے استوار ہیں۔

علم وفضل کی ایک ایسی کہکشاں ہے جس کے دمکتے تارے جویانِ علم کے لیے قندیل رحمانی ہیں۔

درس وتدریس کا ایک ایسا نورانی ادارہ ہے جہاں طالبان علوم نبوت کی تعلیم وتربیت ہوتی ہے۔

تعلیم وتعلم کا ایک ایسا جہاں ہے جس کی فضائیں قال اللہ وقال الرسول کے زمزموں سے معمور رہتی ہیں۔

احسان وسلوک کا ایک ایسا مخزن ہے جہاں انسانی قلوب کا تصفیہ، تزکیہ اورتجلیہ ہوتا ہے۔

شریعت وطریقت کا ایک ایسا ملتقیٰ ہے جہاں برکفے جام شریعت ہے تو برکفے سندان عشق بھی ہے۔

عشق ومحبت حقیقی کی ایک ایسی جلوہ گاہ ہے جہاں مست مے الست معرفت الٰہی کے ساغر لنڈھاتے ہیں۔

کیف وکم کی ایک ایسی بستی ہے جہاں دانائے رموز بستے ہیں۔

علم ومعانی کی ایک ایسی خلد بریں ہے جہاں صہبائے حرم کے بادہ کش رہتے ہیں۔

ذکروفکر کا ایک ایسا معدن ہے جہاں اہل صفا ملتے ہیں۔

قلب ونظر کی ایک ایسی دنیا ہے جہاں اہل جنوں آباد ہیں۔

قرطاس وقلم کا ایک ایسا جلی عنوان ہے جس کا اعتراف زمانہ کرتا ہے۔

الفاظ ومعانی کا ایک ایسا حرم ہے جہاں تحصیل علم کے شیدائی احرام پوش آتے ہیں۔

حکمت وفراست کا ایک ایسا بحرعمیق ہے جس کی لہریں ہمہ دم تموج پزیر رہتی ہیں۔

ایمان ویقین کا ایک ایسا رفیع الشان مرکز ہے جہاں دین حنیف کے داعی ومبلغ تیار کیے جاتے ہیں۔

حمیت وحمایت اسلام کا ایک ایسا عالی شان قصر ہے جہاں اتحادملت پوری معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

حفاظت واشاعت دین کی ایک ایسی پاکیزہ چھاؤنی ہے جہاں اہل ایمان کو بنیان مرصوص بنایا جاتا ہے۔

تصنیف وتالیف کا ایک ایسا خزانہ عامرہ ہے جس کی ثروت میں بفضلہٖ روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔

تحقیق وتخریج کا ایک ایسا بدرمنیر ہے جس کی تب وتاب ایک عالم کوخیرہ کیے ہوئے ہے۔

تذکیر وتبلیغ کا ایک ایسا قطب تارہ ہے جو سرگشتگان راہ کی رہ نمائی کررہا ہے۔

زبان وبیان کا ایک ایسا دبستان ہے جہاں سخن شناسی، سخن فہمی اورسخن وری کے متوالے صفت جام گردش میں رہتے ہیں۔

تہذیب وثقافت کا ایک ایسا میزاب ہے جہاں سے تشنہ کامان ہمہ وقت سیراب ہوتے رہتے ہیں۔

علم وعمل کی ایک ایسی کارگاہ ہے جہاں مس خام کوکندن بنایا جاتا ہے۔

آدم گری وانسانیت سازی کا ایک ایسا کارخانہ ہے جہاں تکریم آدمیت اورتحریم انسانیت سکھائی جاتی ہے۔

کردار سازی کا ایک ایسا معمورہ ہے جہاں مسجود ملائک کو اس کی تخلیق کے اصل مقصد سے واقف کرایا جاتا ہے۔

تدبروانتظام کا ایک ایسا قلعہ معلیٰ ہے جس کے پائے سنگیں پر باطل سرنگوں ہوجاتا ہے۔

اخلاص وایثار کا ایک ایسا مائدہ ربانی ہے جس کی ریزہ چینی کرنے والے زبان، زمان اورمکان کی حدوقید سے بالاتر ہوتے ہیں۔

قلب کی کشادگی، نظر کی بالیدگی اورفکر کی پاکیزگی کا ایک ایسا چشمہ صافی ہے جو مدت دراز سے باغ امت کی آب یاری کررہا ہے۔

الغرض مادرِدرس گاہ دینی علوم وفنون کا ایک ایسا پرکیف، دل آویز، تروتازہ اوروسیع وعریض گلستان ہے جس میں کتاب وسنت، سیرت وسوانح، فقہ، اصول، کلام، تاریخ، بلاغت، زبان، ادب، صحافت اورعصری علوم کے گل ہائے رنگ رنگ قدم قدم پراپنی رونق، نکہت، جمال، خوش نمائی اورخوش بوسے فضاؤں کومعطر کیے رہتے ہیں۔

رب کریم مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے اس چمنستان علم ودانش کو ہمیشہ سرسبز، شاداب اورآباد رکھے۔ اس کی اثرپزیری، معنویت، افادیت اوراہمیت میں بیش ازبیش اضافہ فرمائے۔ اس کو ہرقسم کے شرورِوفتن اورحسد سے محفوظ رکھے۔ اس کے منتظمین، اساتذہ، کارکنان، طلبہ اور جملہ وابستگان کی محنتوں اورکوششوں کو شرف قبولیت بخشے اوران کی توفیقات میں خوب برکتیں عطافرمائے۔ آمین!

☆☆☆

دین وعلم

علم- ہدایت کا ذریعہ یا گمراہی کا ہتھیار

مولانا انیس احمد ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور علم کو اس کی وجہِ فضیلت قرار دیا، انسان کو سارے علوم وفنون سے آگاہ کیا، اپنے نبی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو علم عطا کیا اور فرمایا: "**وما ینطق عن الھویٰ، إن ھو إلا وحی یوحیٰ**" (اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے، یہ تو صرف وحی ہے جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے)۔ آپ ﷺ نے وہ علوم پوری دنیا تک منتقل کیے اور فرمایا: "**إنما بُعثت معلماً**" (میں تو ایک معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں)، اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا: "**إنما أنا قاسم، واللہ یعطی**" (میں تو تقسیم کرنے والا ہوں اور عطا کرنے والا اللہ ہے)۔

علم کا دوسرا نام ادب ہے۔ معلم ہی انسان کو ادب، تہذیب، سلیقہ اور شائستگی سکھاتا ہے، اور تمدن کے دوسرے پہلوؤں کو اس کے سامنے روشن کرتا ہے۔ اصل علم وہی ہے جو انسان کو مہذب وشائستہ بنائے اور اسے انسانیت کے لیے مفید بنائے۔ اسی لیے بجا طور پر یہ کہا گیا ہے: "ادب ہی سے انسان، انسان ہے؛ ادب جو نہ سیکھے وہ حیوان ہے"۔ گویا علم ادب ہے اور ادب ہی انسان کو وجہِ فضیلت پر استوار کرتا ہے۔

اللہ کا یہ بھی کرم ہے کہ اس نے محض پڑھنے لکھنے کا حکم ہی نہیں دیا بلکہ اس بات کی ضمانت بھی لی ہے کہ انسان پڑھے، اس کے لیے جدوجہد کرے، لکھنے کی کوشش کرے اور اظہار کی سعی کرے؛ تو نوازنا، عطا کرنا اور اس کے لیے علم کی راہیں کھولنا ہمارا کام ہے۔ سورۂ علق اس مفہوم کو پوری طرح واضح کرتی ہے۔ اللہ نے جنبشِ قلم کو علم کی دھارا بتایا ہے؛ قلم کے ذریعے علم کے سوتے پھوٹیں گے، اس کے ذریعے مختلف قسم کے علوم وفنون کے ذخیروں کے دروازے وا کیے جائیں گے۔ تحقیق کرنے والے تحقیق کریں گے اور اسے قلم کے ذریعے صفحۂ قرطاس پر لا کر اس علم کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کیا جائے گا۔ اس سے روشنی حاصل کی جائے گی اور آنے والی نسلیں اس علم سے فائدہ اٹھا کر مزید اس میں ترقی اور استحکام کے راستے نکالیں گی۔ اللہ فرماتا ہے، جو علم کی فضیلت کا ایک اہم جز ہے: "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُونَ" (نون، قسم ہے قلم کی اور ان چیزوں کی جو وہ لکھتے ہیں)۔

لیکن یہ علم دودھاری تلوار ہے۔ علم سے انسان محروم ہو تو جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں ڈوبا رہتا ہے اور ٹٹولنے سے بھی راستہ نہیں پاتا، جاہلانہ حرکتیں کرتا ہے، معاشرے کے لیے ناسور بنتا ہے، ادب اور شائستگی سے محروم ہوتا ہے۔ اس کے سلوک وبرتاؤ میں خشونت اور رعونت ہوتی ہے، اس کے اندر اجڈپن اور ہٹ دھرمی ہوتی ہے، مزاج میں حدت وشدت ہوتی ہے۔

اللہ کے نیک بندے، جو اللہ پر یقین کامل رکھتے ہیں اور قرآنی علوم پر ایمان رکھتے ہیں، وہ علم وادب اور شائستگی سے آراستہ ہوتے ہیں۔ وہ عبادُ الرحمن، یعنی اللہ کے حقیقی بندے ہیں۔ اور جو لوگ اس ادب، علم اور شائستگی سے ناآشنا ہوتے ہیں، انہیں قرآن 'جاہل' کے لقب سے مخاطب کرتا ہے۔

قرآن دونوں میں بڑا لطیف فرق بتانے کے ساتھ ساتھ جدلیات کا خوبصورت نیز شائستہ طریقہ بھی سکھاتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

"**وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِینَ یَمْشُونَ عَلَی الْأَرْضِ ھَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُونَ قَالُوا سَلَامًا**" (اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی سے چلتے ہیں، اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: سلام)۔

علم عاجزی، تواضع وانکساری، حلم وبردباری اور سلوک وبرتاؤ میں شائستگی نیز سلیقہ مندی پیدا کرتا ہے۔ آپسی معاشرت میں پڑھا لکھا انسان انسانی اخلاق ومروت، اخلاقِ عالیہ اور اعلیٰ انسانی اقدار کو برتتا ہے، جس سے ایک صاف ستھرا اور پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

مگر علم دودھاری تلوار ہے۔ جس طرح یہ اخلاقِ عالیہ کو سنوارتا ہے، اگر قلب وذہن استوار نہ ہوں تو اس کے برخلاف بھی ہوتا ہے کہ علم سے تواضع اور خاکساری کے بجائے کبر وگھمنڈ، خودسری وانانیت، خودغرضی اور علم کا نشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کے اندر شیطنت اور اس کی چالبازیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس علم سے انسان ہدایت کے بجائے ضلالت وگمراہی کے دلدل میں پھنس جاتا ہے۔

اسی لیے قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"**یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا**" (وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے)۔

اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"**إِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ أَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِینَ**" (اللہ اس کتاب کے ذریعے کچھ لوگوں کو بلند کرتا ہے اور کچھ کو پست کر دیتا ہے)۔

اور ایسا شخص جب علم کا استعمال غلط شروع کر

دیتا ہے تو یہ علم بجائے رحمت کے زحمت اور بجائے نعمت کے لعنت بن جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے علم کے رشتے کو اپنی ذاتِ پاک سے جوڑنے اور اسے مضبوط کرنے کی تاکید کی ہے اور فرمایا:

"وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ" (اور بے شک تمہیں اپنے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے)۔

"وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ" (اور بے شک انتہا تمہارے رب ہی کی طرف ہے)۔

آج کا دور علم اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ علم منتہائے کمال تک پہنچ چکا ہے، سائنس نے ترقی کر کے دنیائے انسانیت کو مادی اعتبار سے ترقی کی معراج تک پہنچا دیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ علم کے منفی استعمال نے دنیا کو جہنم بھی بنا دیا ہے۔

اس روئے زمین کو اللہ نے انسانوں کی آبادی کے لیے ہر اعتبار سے سب سے زیادہ قابلِ رہائش بنایا تھا۔ گیس، آکسیجن، ہوا، پانی، روشنی اور دیگر مادی وغیر مادی وسائل نیز ذرائع پیداوار اور وسائلِ حمل ونقل فراہم کیے، اور فرمایا:

"وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ" (اور ہم نے تمہارے لیے اس میں زندگی گزارنے کے سامان مہیا کیے) غرض یہ کہ بود و باش کے لیے جو اشیاء ضروری ہو سکتی ہیں، سب نہایت وافر مقدار میں یہاں بہم پہنچا دی گئی تھیں۔ گویا کہ سارے سیاروں کے درمیان صرف یہی (زمین) سیارہ ہے جو انسانی زندگی کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہے۔

علم ہی سے تمدن، ثقافت، رہن سہن، نقل و حرکت، وسائل ابلاغ نیز ترسیل مفاہیم کے میدانوں میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے، لیکن مغرب نے علم جیسی پاکیزہ چیز کو متاعِ کوچہ و بازار بنا دیا ہے۔ علم بکتا ہے اور اسے خریدا جا رہا ہے۔ جس کے پاس مادی وسائل کی بہتات ہے، وہ اپنے بچوں کے لیے مہنگے اسکولوں کے ذریعے اعلیٰ تعلیم خرید لیتا ہے، مادی وسائل اور فنانس کے ذریعے اچھے معیاری اسکول میں داخلہ دلا کر انہیں معیاری تعلیم سے آراستہ کرتا ہے۔

یہی بچے جب اعلیٰ تعلیم کے لیے بے پناہ روپیہ خرچ کرنے کے بعد عملی میدان میں آتے ہیں تو وہ اتھاہ دولت کمانا چاہتے ہیں، اور اس کے لیے بعض اوقات حیوانیت کی حدود بھی پار کر جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف مادی وسائل سے محروم لوگ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلا پاتے، نتیجتاً وہ چاہے جتنے خوش اخلاق، متواضع اور مہذب ہوں، پھر بھی پسماندہ اور غیر مہذب سمجھے جاتے ہیں۔

مغرب نے علم کے تئیں انسان کی سوچ کو بدل دیا، اسے صرف دولت کمانے کا آلہ بنا دیا اور اسے تعمیر سے زیادہ تخریب کے لیے استعمال کیا۔

علم کا یہی پہلو اس کا ایک منفی استعمال ہے اور معاشرے کے لیے مہلک اور خطرناک بھی۔ مثلاً طبی اداروں میں بھی علم کے منفی استعمال کی مختلف شکلیں اختیار کی جاتی ہیں جو معاشرے کے لیے ناسور کی طرح نقصان پہنچا رہی ہیں۔ مادہ کے حصول کے لیے مریض کی زندگی سے کھلواڑ کیا جاتا ہے۔

علم کا سب سے بڑا منفی استعمال وہ ہے جو سائنس دانوں نے کیا۔ علم و تحقیق کے بعد وہ جس نتیجے پر پہنچے، اسے بجائے نقل وحمل، تعمیر وتشکیل، ایجاد و ترقی کے، آلاتِ حرب وضرب کے فروغ، انسانی آبادی کی تخریب و بربادی، جنگلات کے صفایا، پہاڑوں کے خاتمے، اور ایسی دواؤں کی ایجاد و فروغ میں استعمال کیا جو انسانوں اور جانوروں کے لیے نہایت مہلک ہیں۔

آئنسٹائن جس نے سب سے پہلے ایٹمی طاقت (ایٹمی فشن) کے امکان کو سمجھا اور یہ جانا کہ نیوکلیائی طاقت تباہ کن بھی ہو سکتی ہے، تو اس نے کئی مرتبہ تشویش ظاہر کی اور کہا کہ ایٹمی طاقت کے اندھا دھند استعمال نے ہماری سوچ کے علاوہ دنیا کی ہر چیز کو بدل دیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے نہیں معلوم تیسری جنگِ عظیم کن ہتھیاروں سے لڑی جائے گی، لیکن چوتھی جنگِ عظیم پتھروں اور لاٹھیوں سے لڑی جائے گی۔

آئن سٹائن نے امریکہ کے صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ کو ۱۹۳۹ء میں جو خط لکھا، اس میں خبردار کیا کہ نازی جرمنی ایٹم بم بنا سکتا ہے۔ یہ خط ہی مین ہیٹن پروجیکٹ کے آغاز کی بنیاد بنا اور امریکیوں نے خفیہ طور پر ایٹم بم بنا لیا اور جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرا دیا۔ یہ علم کا منفی استعمال تھا۔ آئن سٹائن نے بعد میں بہت افسوس کا اظہار کیا اور ہتھیار جمع کرنے کے خلاف اور امن نیز جمہوریت کے لیے مہم چلاتا رہا۔

مغرب نے علم کا منفی استعمال کر کے پوری دنیا پر اپنی استعماری طاقت کو مسلط کرنا چاہا، اور اسی کشمکش اور تناؤ کی وجہ سے پہلی جنگِ عظیم لڑی گئی، اور اس کی تلخیوں اور نقصانات سے دنیا ابھی جانبر بھی نہ ہوئی تھی کہ دوسری جنگِ عظیم کی ہولناکیوں سے دوچار ہوئی۔ اس کے بعد دنیا اب تیسری جنگِ عظیم کے دہانے پر ہے اور یہ سب مغرب کی چالبازیوں کی وجہ سے ہے۔

علم اور ذہانت کا منفی استعمال کر کے مغرب دوسرے ملکوں کو کمزور کرتا ہے، وہاں خلفشار و انتشار نیز خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور اپنے اسلحہ کی تجارت کو فروغ دیتا ہے، اور اس طرح اپنی چودھراہٹ قائم کرتا ہے۔

دیکھیے اب یہ چودھراہٹ دنیا کے کن کن ملکوں کو اپنی استعماری طاقت اور اپنے مہلک ہتھیاروں کا نشانہ بناتی ہے؟

☆☆☆

اصلاحِ حال

لڑکیوں کا ارتداد اور ہماری ذمہ داریاں

محمد ناصر ندوی پرتاپگڑھی (دبئی، متحدہ عرب امارات)

امت مسلمہ آج جن فکری، تہذیبی اور دینی آزمائشوں سے دوچار ہے، ان میں مسلمان لڑکیوں کا ارتداد ایک نہایت نازک، دردناک اور تشویشناک مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ محض کسی ایک فرد کے دین تبدیل کرنے تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے اثرات خاندان، معاشرے اور آنے والی نسلوں تک سرایت کر جاتے ہیں۔

ارتداد ایمان جیسی عظیم نعمت سے محرومی کا نام ہے، اور جب یہ محرومی ہماری ان بیٹیوں سے وابستہ ہو جو آئندہ نسلوں کی امین اور معاشرے کی معمار ہوتی ہیں تو اس کی سنگینی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے ارتداد کی سنگینی کو نہایت واضح انداز میں بیان فرمایا ہے:

"وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ"۔ (البقرۃ:۲۱۷)

ترجمہ: اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے، پھر کفر کی حالت میں مر جائے تو ایسے لوگوں کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے۔

یہ آیت اس حقیقت کو واشگاف کرتی ہے کہ ارتداد محض ایک وقتی لغزش نہیں بلکہ دنیا و آخرت کی ناکامی اور اعمال کی بربادی کا سبب ہے۔

اگر اس مسئلے کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو متعدد اسباب سامنے آتے ہیں۔ سب سے بنیادی سبب دینی تربیت کا فقدان ہے۔ بہت سی بچیاں مسلمان گھرانوں میں پیدا تو ہوتی ہیں، مگر ان کی پرورش اسلام کی روح اور شعور کے ساتھ نہیں ہو پاتی۔ دین ان کے لیے زندہ اور بامعنی حقیقت کے بجائے چند رسمی عبادات اور تہواروں کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ

(البخاری:۱۳۵۸)

ترجمہ: ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔

جب اس فطرت کی صحیح آبیاری نہ کی جائے تو بیرونی اثرات اسے آسانی سے بدل دیتے ہیں۔

خاندانی غفلت اور والدین کے قول و عمل کا تضاد بھی ایک اہم سبب ہے۔ جب والدین زبان سے دین کی بات کریں مگر عملی زندگی میں اس کی جھلک نظر نہ آئے تو نئی نسل کے ذہن میں دین کی صداقت مشکوک ہو جاتی ہے۔ بعض گھروں میں بے جا سختی، بیٹے اور بیٹیوں میں امتیازی سلوک یا ناانصافی بچیوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے، اور وہ اپنی محرومیوں کو دین بیزاری کی شکل میں ظاہر کرتی ہیں۔

تعلیمی اداروں کا غیر دینی ماحول اور مادہ پرستانہ فکر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ بعض اداروں میں مذہب کو محض ذاتی معاملہ یا پسماندگی کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ میڈیا، فلموں، ڈراموں اور سوشل پلیٹ فارمز کے ذریعے غیر اسلامی طرزِ زندگی کو پُرکشش انداز میں دکھایا جاتا ہے، جبکہ حیا، پردہ اور مذہبی وابستگی کو دقیانوسیت کا عنوان دے دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بعض مواقع پر جذباتی استحصال، جھوٹے وعدے اور پرفریب جال بھی کم سن بچیوں کو غلط راستے کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ بعض عناصر فکری یا جذباتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اس نازک صورتحال میں سب سے پہلی اور بنیادی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید کا حکم ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (التحریم:۶)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

یہ حفاظت صرف جسمانی نہیں بلکہ فکری، اخلاقی اور دینی بھی ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کے دل میں اللہ، اس کے رسول ﷺ اور دین اسلام کی محبت راسخ کریں۔ دین کو محض خوف، جبر یا رسمی پابندیوں کے ذریعے پیش کرنا دیرپا اثر پیدا نہیں کرتا، محبت، اعتماد اور حکمت ہی دلوں کو جیتتی ہے۔

آج کی نسل سوال کرتی ہے۔ اگر اس کے سوالات کو دبایا جائے یا انہیں سنجیدگی سے نہ لیا جائے تو وہ جوابات کی تلاش میں باہر نکلتی ہے، جہاں گمراہی کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچیوں کے شبہات اور سوالات کا مدلل، حکیمانہ اور ہمدردانہ جواب دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ (ابن ماجہ:۲۲۴)

(باقی صفحہ نمبر ۲۰ پر)

احوالِ عالم

عہدِ ظلمت کی بازگشت

ڈاکٹر محمد وثیق ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

موجودہ دور میں عالمی سیاست جس اضطراب، کشمکش اور بے یقینی سے دوچار ہے، وہ اہلِ فکر و نظر کو اس سوال پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا انسانیت ایک بار پھر اسی تاریکی کی طرف لوٹ رہی ہے جس سے وہ صدیوں پہلے گزر چکی ہے؟ عالمی طاقتوں کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی، اسلحہ کی دوڑ، سیاسی مداخلتیں اور کمزور ممالک پر تسلط قائم کرنے کی کوششیں، اس اندیشے کو تقویت دیتی ہیں کہ دنیا ایک خطرناک موڑ پر کھڑی ہے۔

خصوصاً امریکہ کی جانب سے۔امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی قیادت میں۔دنیا پر اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے یا کیے جا رہے ہیں، وہ اس عالمی کشمکش کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ان اقدامات میں مختلف ممالک کے داخلی معاملات میں مداخلت، اقتصادی پابندیاں اور بھاری ٹیکس عائد کرنا، حکومتوں کو عدم استحکام سے دوچار کرنا اور اپنے سیاسی مفادات کے لیے احتجاجی تحریکوں یا بغاوتوں کو ہوا دینا شامل ہے۔ ان پالیسیوں کو عموماً قومی سلامتی، عالمی استحکام یا انسانی حقوق کے تحفظ جیسے دلکش نعروں کے تحت پیش کیا جاتا ہے، مگر حقیقت میں یہ اقدامات عالمی امن کے لیے سنگین خطرات پیدا کرتے ہیں۔

عالمی طاقتوں کی سیاست کا بنیادی محرک ہمیشہ اقتدار اور مفادات کا تحفظ رہا ہے، موجودہ دور میں بھی بڑی طاقتیں دنیا کے مختلف خطوں میں اپنی سیاسی، اقتصادی اور عسکری بالادستی قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔اس مقصد کے لیے وہ مختلف حربے اختیار کرتی ہیں، مثلاً:

- کمزور ممالک پر اقتصادی پابندیاں اور دباؤ
- سیاسی احتجاج اور تحریکوں کی سرپرستی۔
- حکومتوں کی تبدیلی کے لیے خفیہ یا علانیہ مداخلت۔
- عسکری کارروائیاں یا حملوں کی دھمکیاں۔
- عالمی اداروں کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا۔

یہ اقدامات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ دنیا گویا تاریک دور (Dark Age) کی طرف لوٹ رہی ہے، جہاں امن و استحکام عنقا تھا، ظلم وتشدد، جارحیت و بربریت، بدامنی اور لاقانونیت عام تھی، طاقت ور کمزور پر ظلم وزیادتی کر رہا تھا اور قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔

مغربی مورخ رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) یورپ کے عہدِ تاریک کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی، اس دور کی وحشت و بربریت زمانہ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی چڑھی تھی، کیونکہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی جو سڑ گئی ہو، اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی، وہ ممالک جہاں یہ تمدن برگ و بار لایا اور گذشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ گیا تھا جیسے اٹلی، فرانس، وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا''۔

(The Making of Humanity)

(ترجمہ ''نبی رحمت'' ص:۳۷۔۳۸)

مشرق کی رومن شہنشاہی میں ٹیکسوں کی اتنی بھر مار تھی کہ اہل ملک اپنی حکومت پر ہر غیر ملکی حکومت کو ترجیح دینے لگے تھے، بار بار انقلابات اور بغاوتیں ہوتی تھیں، صرف ۵۳۳ء کے ایک فساد میں قسطنطنیہ کے تیس ہزار آدمی قتل کیے گئے، ان کا سب سے بڑا مشغلہ اور دلچسپی کسی نہ کسی ذریعہ سے مال حاصل کرنا پھر عیش وعشرت میں اس کو خرچ کرنا تھا، تفریح وتعیش میں وہ اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ اس کی سرحدیں درندگی و بربریت سے مل گئی تھیں۔

CIVILIZATION PAST AND PRESENT کے مصنفین نے بازنطینی سوسائٹی کے اس عجیب تضاد اور اخلاقی فساد، تفریح طبع اور عیش کے عشق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:۔

''بازنطینیوں کی سماجی زندگی میں زبردست تضاد پایا جاتا تھا، مذہبی رجحان ان کے ذہنوں میں گہرے طور پر پیوست ہو چکا تھا، ترک دنیا اور رہبانیت سلطنت کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تھی اور معمولی درجہ کا شہری بھی عمیق مذہبی مباحث میں گہری دلچسپی لیتا تھا اور اس کے ساتھ سبھی لوگوں کے روزمرہ کی زندگی پر اسرار پسندی اور باطنیت کی چھاپ لگی ہوئی تھی، لیکن اس کے برعکس یہی لوگ ہر قسم کے کھیل تماشوں کے غیر معمولی شائق بھی تھے، زبردست سرکس کے میدان تھے، جس میں اسی (۸۰) ہزار تماش بینوں کے بیٹھنے کی جگہ

تھی جہاں رتھوں کے دوڑ کے زوردار مقابلے ہوا کرتے تھے، عوام کو نیلے اور ہرے دو گروہوں میں بانٹ دیا گیا تھا، بازنطینیوں میں حسن سے پیار بھی تھا اور ظلم وخباثت کا رجحان بھی، ان کے کھیل تماشے اکثر خونریز اور اذیت رساں ہوتے تھے، ان کی اذیتیں ہولناک اور ان کے خواص کی زندگی عیش وطرب، سازش، تکلفات اور برائیوں سے مرکب تھی''۔ (''نبی رحمت'' ص: ۳۰-۳۱)

قدیم ایرانی سلطنت میں بھی اخلاقی اور سماجی زوال نمایاں تھا۔ مورخین کے مطابق وہاں بے حیائی اور اخلاقی بے راہ روی عام ہو چکی تھی، نئی نسل میں نہ عزتِ نفس باقی رہی تھی اور نہ کوئی اجتماعی مقصد، بے حسی، کاہلی اور سازشیں معاشرتی زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔ ''ایران بعہد ساسانیان'' کا مصنف آرتھر کرسٹن سین لکھتا ہے:۔

''ناموس ادب کا پردہ اٹھ گیا، ایسے لوگ پیدا ہو گئے جن میں نہ شرافت تھی نہ عمل، نہ ان کے پاس موروثی جاگیر تھی اور نہ انھیں خاندان اور قوم کا غم تھا، نہ ان میں صنعت تھی نہ حرفت، نہ انھیں کسی قسم کی فکر دامن گیر تھی اور نہ ان کا کوئی پیشہ تھا، چغلی اور شرارت میں مستعد اور دروغ بیانی اور تہمت میں مشاق تھے، یہی ان کا ذریعہ معاش تھا اور اسی کو وہ تحصیل مال وجاہ کا وسیلہ بناتے تھے''۔

(نبی رحمت، ص: ۳۲)

''شام جو بازنطینی شہنشاہی کی دوسری ریاست تھی، اہل روما کی توسیع پسندی اور ہوس ملک گیری کا شکار تھا، جہاں صرف طاقت کے سہارے غیر ملکیوں کی طرح حکومت کی جاتی تھی اور محکوم رعیت کو کبھی شفقت ومحبت سے واسطہ نہ پڑتا تھا، افلاس کا حال یہ تھا کہ اکثر شامی اپنا قرض ادا کرنے کے لیے اپنے بچوں کو فروخت کر دیتے تھے، مختلف نوع کے مظالم اور حق تلفیوں، غلام بنانے اور بیگار لینے کا عام رواج تھا''۔ (نبی رحمت، ص: ۳۱)

اسلام سے پہلے عرب معاشرہ بھی شدید قبائلی اور نسلی، خاندانی اور خونی عصبیت اور جنگ وجدال کا شکار تھا، معمولی واقعات پر طویل جنگیں چھڑ جاتی تھیں جو کئی دہائیوں تک جاری رہتیں، جنگ ان کی گھٹی میں پڑی تھی، خونریزی عام تھی اور قبائلی وفاداری اس قدر شدید تھی کہ یہ مقولہ مشہور تھا: ''اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم''۔

ایک دوسرے کو قتل کرنا ان کے لیے ایک کھیل اور تفریح تھا اور جنگیں بعض اوقات تفریح اور فخر کا ذریعہ بن جاتی تھیں، شاعر قطامی تغلبی کے اشعار اس ذہنیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

وأحیاناً علی بکر أخینا - إذا ما لم نجد إلا أخانا

اگر تاریخ کے ان واقعات کو موجودہ عالمی حالات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو حیرت انگیز مماثلت سامنے آتی ہے، آج بھی دنیا میں:

اسلحہ کی دوڑ جاری ہے، عالمی طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں، کمزور ممالک سیاسی اور عسکری دباؤ کا شکار ہیں، مختلف خطوں میں جنگیں اور خونریزی جاری ہے، چاہے غزہ، یوکرین، ایران، سوڈان، شام، صومالیہ یا دنیا کے دیگر خطے ہوں، ہر جگہ طاقت کی سیاست غالب نظر آتی ہے۔ طاقتور قومیں کمزور قوموں کو روندنے اور اپنے اقتدار کو وسیع کرنے میں مصروف ہیں، وہ دنیا کے اہم مراکز، اسٹریٹجک علاقوں، سمندری راستوں، بندرگاہوں، اور تیل، معدنیات اور قدرتی وسائل سے مالا مال علاقوں پر قبضہ جمانے کی کوشش کر رہی ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ جدید تہذیب کی چمک دمک کے باوجود انسانیت ایک نئے عہدِ تاریکی کے دہانے پر کھڑی ہے۔

دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی یہ شدید خواہش۔ بلکہ اقتدار کا جنون۔ ہی دراصل موجودہ جنگوں اور بحرانوں کی اصل وجہ ہے؛ خواہ وہ یوکرین، وینزویلا، گرین لینڈ، تائیوان یا سنکیانگ کے مسائل ہوں، یا یمن، سوڈان، صومالیہ، شام، افغانستان، بنگلہ دیش اور نیپال کے بحران۔

ہر عالمی طاقت (امریکہ، برطانیہ، روس، چین، فرانس) دوسرے کو زیر کرنے اور اپنے مفادات کو اس پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جمہوریت، آزادی اور انسانی حقوق کے نام پر ایک نیا استعمار جنم لے رہا ہے۔ ایک ایسا استعمار جو نئے ناموں اور دل فریب نعروں کے ساتھ سامنے آیا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ دنیا ایک جنگل بن گئی ہے جس میں درندے دندناتے پھر رہے ہیں؛ نہ کوئی نظام ہے، نہ انصاف، نہ انسانیت، نہ معاہدوں کی پاسداری اور نہ عالمی اداروں کا کوئی حقیقی اثر باقی رہ گیا ہے، صرف ایک ''ڈکٹیٹر'' ہے جو پوری دنیا پر کنٹرول چاہتا ہے، اس کے لیے کہیں غنڈہ گردی سے کام لیتا ہے، کہیں گولی بارود استعمال کرتا ہے، کہیں مخالف نظام کو بدلنے کے لیے سازشیں کرتا ہے، کہیں حکومت مخالف عناصر کی پشت پناہی کرتا ہے، وہ پورے عالم پر حکومت کا خواب دیکھ رہا ہے، اسی لیے مختلف ملکوں پر حملہ کی دھمکی دیتا ہے، بلکہ حملہ کرتا ہے اور اس کے راستہ میں جو رکاوٹ بنتا نظر آتا ہے اس کو مار دیتا ہے، جیسا کہ ماضی میں سکندر مقدونی اور جولیس سیزر (Julius Caesar) نے کیا اور اخیر عہد میں ہٹلر، موسولینی، اسٹالن، ماؤتسے تونگ (ماؤ زدونگ) اور کیم ایل سونگ نے کیا۔ لیکن غور کیجئے ان کو کیا ملا؟ کتنی عمر پائی۔۔؟ سب قصہ پارینہ بن گئے، اس میں موجودہ

حکمرانوں کے لیے عبرت کا سامان ہے، تاریخ بہترین معلم ہے، موجودہ حکام کو چاہیے کہ تیسری جنگ چھڑے جس کے آثار نمایاں ہیں، اس سے پہلے ماضی کے واقعات سے سبق لیں، اور ہوش کے ناخن لیں۔

موجودہ عالمی حالات اس حقیقت کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ طاقت اور مفاد کی بنیاد پر قائم نظام دیر پا نہیں ہوتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی دنیا میں ظلم، استبداد اور طاقت کی سیاست غالب ہوئی ہے تو اس کا انجام تباہی اور انتشار کی صورت میں سامنے آیا ہے۔

ایسے میں دنیا کو ایک عادل اور متوازن قیادت کی ضرورت ہے، جو ظلم وعدل کے درمیان فرق کر سکے۔ یہ ذمہ داری دراصل مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے، کیونکہ وہ امتِ وسط ہیں اور انسانیت کے لیے گواہ اور رہنما بنائے گئے ہیں۔ مگر افسوس کہ باہمی اختلافات، ذاتی مفادات، سیاسی کمزوری اور مادہ پرستی کی تربیت اور ذہنیت اس قیادت کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے۔

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:۔

''مغربی قیادت کے نتیجے میں دنیا ایک آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے، جب تک مغرب اپنی موجودہ صورت میں دنیا کی رہنمائی کرتا رہے گا، انسانیت کے لیے نہ کوئی حقیقی اصلاح ممکن ہے اور نہ پائیدار امن، انسانیت کی فلاح اسی وقت ممکن ہے جب قیادت اس مادی اور خودغرض مغرب کے ہاتھ سے نکل کر ایسے لوگوں کے پاس پہنچے جو دنیا کو نئی روح اور نئی ذمہ داری کے ساتھ سنبھالیں اور وہ مسلمان ہیں جن کا دنیا انتظار کر رہی ہے''۔

☆☆☆

سید احمد شہید اکیڈمی کی جدید مطبوعات

مصنف: حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ (ناظم ندوۃ العلماء)

بعض باطل عقائد ونظریات اور اہل سنت کا مسلک ومنہج

☆ کتاب وسنت اور اقوال سلف کی روشنی میں روافض کے باطل عقائد کا بہترین تجزیہ!
☆ گمراہ کن نظریات وخیالات کی وضاحت اور متوازن طرز فکر!
☆ محبت صحابہ ومحبت اہل بیت رضی اللہ عنہم کے سلسلے میں راہِ اعتدال!
صفحات:72 قیمت:70

زمانہ کا چیلنج اور اس کا مقابلہ

(پیام انسانیت کے کارکنوں کے درمیان کی گئی چند تقریروں کا مجموعہ)
☆ ہند تواوادکا مقابلہ؛ کیوں اور کیسے؟ ☆ اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کا عملی طریقہ!
☆ پیام انسانیت کی ضرورت اور افادیت!
صفحات:144 قیمت:130

تحریک ندوۃ العلماء- عصر حاضر میں اس کی معنویت وافادیت

☆ تحریک ندوۃ العلماء کی امتیازی خصوصیات!
☆ موجودہ حالات اور تحریک ندوہ کی ضرورت!
☆ فضلائے ندوۃ العلماء اور ان کی ذمہ داریاں!
صفحات:128 قیمت:90

چند روز امریکہ میں

(سفر امریکہ کی مختصر روداد اور آٹھ روزہ قیام کے دوران کیے گئے خطابات کا مجموعہ)
☆ امریکہ کے چار اہم شہروں؛ شکاگو، سیاٹل، نیویارک اور فلوریڈا کی مختصر روداد سفر!
☆ امریکہ کے موجودہ حالات اور وہاں کی داخلی وخارجی پالیسی کا منصفانہ تجزیہ!
☆ امریکہ میں اسلام کی بڑھتی ہوئی محبوبیت اور داعیان اسلام کی محنتوں کا تذکرہ!
☆ بارہ اہم اور دردانگیز خطابات نیز ایک فکری انٹرویو کا مجموعہ!
صفحات:192 قیمت:160

رابطہ کریں
مولانا محمد ایوب صاحب ندوی (9919331295)

کتابِ ہدایت

قرآن- تاریخ کا سب سے بڑا معجزہ

ڈاکٹر محمد نصر اللہ ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

آج سے چودہ سو سال پہلے فاران کی چوٹی پر ایک بندۂ خدا مادی دنیا سے کنارہ کش ہو کر عالم استغراق میں گم تھا کہ اچانک لوحِ محفوظ سے ایک سورج طلوع ہوا اور اس بندۂ خدا کے سینے میں غروب ہو گیا، پھر اس کی کرنیں دنیا کے ہر گوشے میں پھیل گئیں اور اس کے انوار و تجلیات سے ہر خطہ منور ہو گیا۔ کیا عرب اور کیا عجم! سب اس کے جلووں سے مسحور ہو گئے۔

آپ جانتے ہیں وہ کون سا سورج تھا؟

وہ ہدایت و نجات کا آفتاب تھا جس کی شعاعوں نے کفر و شرک کی تاریکیوں کو کافور کر دیا۔ جس کی نغمگی اور دل آویز موسیقی نے اہلِ زبان کو ششدر و حیران کر دیا، جس کی فصاحت و بلاغت نے عرب کے خطباء کو سر دھننے پر مجبور کر دیا، جس کے اسلوب کے سامنے بڑے بڑے شاعروں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ جس کے علم و حکمت کے سامنے معرفت کے بڑے بڑے دعوے دار بونے نظر آنے لگے۔

جس کے کلمات اور تعبیرات نے عربی زبان کے دامن کو لعل و گہر سے بھر دیا، جس کی لطافت اور پاکیزگی کے سامنے غنچے اور کلیاں بھی ماند پڑ گئیں، جس کے حسنِ بیان کے سامنے چاند بھی بے نور نظر آنے لگا۔ جس کے معانی کی ندرت اور بدیع اسلوب نے بلاغت کو عروج عطا کیا، جس کے غرائب و نظائر نے انسانی فکر میں بالیدگی پیدا کی، جس کے امثال و حکم نے تخیل کو نئی پرواز دی، جس کے وجوہِ اعجاز نے ادباء اور اہلِ فکر کے سامنے غور و تدبر کے نئے زاویے کھول دیے۔

جس کی تشبیہات اور استعارات سے فن بلاغت کو جِلا ملی، جس کے اصول و قواعد نے عربی زبان کو استحکام بخشا اور جس کے الفاظ نے عربی کو ایک زندہ و جاوید زبان بنا دیا۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خالقِ کائنات نے لی ہے، جس کے احکام دین کی بنیاد ہیں اور جس کی تعلیمات ابدی اور لافانی ہیں۔

یہ قرآن کا معجزانہ پہلو ہے جس میں دنیا کی کوئی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے اور جو درحقیقت اس کے نزول کا اصل مقصد ہے، اور وہ یہ ہے کہ قرآن ساری انسانیت کے لیے ایک عظیم ہدایت نامہ ہے۔

یہ ایسی کتاب ہے جس کی تاثیر بے مثال ہے۔ یہ اپنے پیروکاروں کو ایمان و یقین کے جذبے سے سرشار کر دیتی ہے۔ اس نے کفر کے ظلمت کدے میں توحید کا ایسا چراغ روشن کیا کہ اس کا ہر گوشہ جگمگا اٹھا۔ اس نے نبوت کا ایسا اعلان کیا کہ خدا کے بعد وہ عقیدت و محبت کا سب سے بڑا مرکز بن گئی۔

اسی قرآن نے عرب کے صحراء نشینوں کو تمدن کا امام بنا دیا، جہالت و سفاہت کے پتلوں کو تہذیب کا علمبردار بنا دیا، ضلالت و گمراہی کے دلدل میں ڈوبی ہوئی قوم کو رشد و ہدایت کا پیشوا بنا دیا۔

اس نے دنیا کو امانت کا پیغام دیا، پاکدامنی اور عفت و عصمت کا مفہوم سمجھایا، بے حیائی اور فحاشی سے روکا، انسانی جان کی قدر و قیمت واضح کی، حرام خوری پر وعیدیں سنائیں اور اکلِ حلال پر زور دیا۔ اس نے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور حسنِ سلوک کی تاکید کی، اخلاق و کردار کا درس دیا، جنگ و خون ریزی کی شناعت بیان کی اور امن و سلامتی کے پھول برسائے۔

اس نے اخوت و بھائی چارے کا ساز چھیڑا، ہمدردی اور مساوات کا نغمہ سنایا، ظلم اور ناانصافی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور عدل و انصاف کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس نے اعلیٰ انسانی قدروں کو زندہ کیا، دلوں میں خدا کا خوف پیدا کیا اور آخرت کا احساس جاگزیں کیا۔ اس نے ہر طرح کے تعصب، تفریق اور امتیاز کو ختم کر کے صرف نیکی اور تقویٰ کو فضیلت کا معیار قرار دیا، کیونکہ تقویٰ ہی اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔

قرآن کے اعجاز کا سب سے نمایاں پہلو ہدایت ہے۔ یہ سراپا رہنمائی کی کتاب ہے۔ یہ گم گشتہ راہ انسانوں کو معرفت سے ہمکنار کرتی ہے، ضلالت کی تاریکیوں سے نکال کر توحید کے نور کی طرف لاتی ہے، کفر و شرک کی وادیوں سے نکال کر ایمان کی شاہراہ پر گامزن کرتی ہے۔

یہ بدعات و خرافات کی ظلمتوں کو چاک کر کے رشد و ہدایت کا چراغ جلاتی ہے، فکری کجی کو دور کرتی ہے، بصیرت و فراست عطا کرتی ہے، ذہن و دماغ کی تاریکیوں کو مٹا کر عقل و شعور کو روشنی بخشتی ہے اور جہالت کے پردوں کو ہٹا کر علم کی قبا مرحمت کرتی ہے۔

اسی قرآن نے صرف تیئس سال کی مختصر مدت میں ایک اَن پڑھ قوم کو دنیا کی متمدن ترین قوموں میں شامل کر دیا۔ اسی قوم نے قیصر و کسریٰ کے غرور کو خاک میں ملا دیا، دنیا کی کایا پلٹ دی اور سیاست و حکمرانی کی ایسی مثال قائم کی کہ دنیا کی شہنشاہی کے تاج اس کے سر پر سجائے گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی سب سے کمزور اور منتشر قوم سب سے زیادہ منظم اور طاقتور قوم بن گئی۔

قرآن نے باطل کے طلسم کو یکسر توڑ دیا، بت پرستی کی جڑوں پر تیشہ چلا دیا، آتش پرستی کا چراغ گل کر دیا، دختر کشی کی لعنت کو مٹا دیا، عورتوں کے سروں پر عزت و وقار کا تاج رکھا، غلاموں کو آزادی کا پروانہ دیا اور شاہ و گدا کو ایک صف میں کھڑا کر دیا۔ اس نے اعلان کیا کہ سعادت کا راستہ مال و زر کے انبار، جاہ و منصب کی فراوانی اور طاقت و قوت کی کثرت سے نہیں گزرتا، بلکہ اس کا راز ایک خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں پوشیدہ ہے۔

جو اس حقیقت کو پا لیتا ہے وہی دونوں جہانوں میں سربلند ہوتا ہے۔ جو اس آستانہ سے وابستہ ہو جاتا ہے وہ دنیا کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کا ہر عمل رب کی خوشنودی کے لیے ہوتا ہے، اس کا ہر قدم دین کی سربلندی کے لیے اٹھتا ہے اور اس کی پوری زندگی حق کے غلبے کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن صرف ایک مقدس کتاب نہیں بلکہ انسانیت کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ وہ معجزہ ہے جو قیامت تک زندہ اور تابندہ رہے گا۔ اس کی ہدایت ہر زمانے کے انسان کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

اگر آج کی دنیا قرآن کی تعلیمات کو اخلاص کے ساتھ اپنا لے تو ظلم، نفرت، ناانصافی اور انتشار کی تاریکیاں خود بخود مٹ سکتی ہیں۔ قرآن ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ اصل کامیابی اللہ کی اطاعت، رسول ﷺ کی اتباع اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے میں ہے۔

یہی وہ نور ہے جو دلوں کو زندہ کرتا ہے، یہی وہ ہدایت ہے جو انسان کو دنیا و آخرت کی کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔

☆☆☆

بقیہ: لڑکیوں کا ارتداد اور ہماری ذمہ داریاں

ترجمہ: علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

یہ فرض مرد و عورت دونوں کے لیے یکساں ہے، اور بالخصوص ایسے دور میں دینی علم کی مضبوط بنیاد ناگزیر ہے۔

علماء کرام، ائمہ مساجد، تعلیمی ذمہ داران اور دانشورانِ قوم پر بھی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس نازک موضوع پر مکمل و منظم توجہ اور حکمتِ عملی کی اشد ضرورت ہے۔ محض وقتی ردِّ عمل یا جذباتی بیانات مسئلے کا حل نہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ سنجیدہ فکری رہنمائی فراہم کی جائے، نوجوان لڑکیوں کے لیے محفوظ اور باوقار تعلیمی و تربیتی ادارے قائم کیے جائیں، اور دین کو آسان، معقول اور قابلِ عمل انداز میں پیش کیا جائے۔ نبی کریم ﷺ عورتوں کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے اور ان کی عزت و تکریم کو ایمان کا حصہ قرار دیتے تھے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ

ترجمہ: تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو۔

اصلاح کے عملی پہلوؤں میں چند امور نہایت اہم ہیں۔ خواتین معلمات اور مربیات تیار کی جائیں جو ہر علاقے میں براہِ راست دینی و فکری رہنمائی فراہم کر سکیں۔ مساجد اور دینی اداروں میں خواتین کے لیے خصوصی دروس، تربیتی نشستیں اور سوال و جواب کے پروگرام منعقد کیے جائیں تاکہ ان کی الجھنیں بروقت دور کی جا سکیں۔

نکاح کو آسان اور غیر ضروری رسوم سے پاک بنایا جائے تاکہ غیر شرعی تعلقات کا دروازہ بند ہو اور نوجوان نسل کو بآسانی پاکیزہ راستہ میسر آئے۔

تعلیمی نصاب میں اخلاقی و روحانی تربیت کو مضبوط کیا جائے اور گھروں میں دینی ماحول کو عملی صورت دی جائے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ اس مسئلے کو محض جذباتی زاویے سے نہ دیکھا جائے بلکہ سنجیدہ طرزِ فکر اختیار کیا جائے۔

ہر واقعہ کے پیچھے سماجی حالات، نفسیاتی عوامل اور خاندانی پس منظر کارفرما ہوتا ہے۔ ان پہلوؤں کو سمجھے بغیر صرف ردِّ عمل دینا دیرپا حل فراہم نہیں کرتا۔ ہمیں اجتماعی احتساب کے ساتھ اصلاح کی طرف پیش قدمی کرنی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ لڑکیوں کا ارتداد صرف ان کا ذاتی مسئلہ نہیں بلکہ ہماری اجتماعی کمزوریوں کا آئینہ دار ہے۔ اگر ہماری بیٹیاں دین سے دور ہو رہی ہیں تو ہمیں اپنے گھروں، اپنے نظامِ تربیت اور اپنے معاشرتی رویّوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ ایمان کی حفاظت صرف نصیحت سے نہیں بلکہ محبت، اعتماد، صحیح رہنمائی اور مضبوط تعلق سے ہوتی ہے۔ جس دل کو گھر میں عزت، اپنائیت اور دینی شعور مل جائے، وہ باہر کے فتنوں کا آسانی سے شکار نہیں بنتا۔

وقت کا تقاضا ہے کہ ہم ایک دوسرے پر الزام تراشی کے بجائے منظم اصلاح کی تحریک چلائیں، اپنی بیٹیوں کو اللہ کی امانت سمجھ کر ان کی دینی، اخلاقی اور فکری تربیت کا سنجیدگی کے ساتھ اہتمام کریں۔ اگر ہم حکمت، بصیرت اور اخلاص کے ساتھ اس چیلنج کا مقابلہ کریں تو یہی بچیاں کل امت کی باوقار اور باکردار معمار بن سکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی امانتوں کی صحیح حفاظت کرنے، اپنی نسلوں کے ایمان کی پاسبانی کرنے اور ایک صالح، باوقار اور دین دار معاشرہ تشکیل دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

صحبتے باالولیاء

صحبت اللہ والوں کی

محمد کلام الدین ندوی (معاون انچارج مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ)

نیک صحبت کا اثر انسان کی زندگی پر گہرااور مثبت ہوتا ہے یہ کردار سازی مثبت سوچ اور دینی ودنیاوی کامیابی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، جب کہ بری صحبت انسان کو گمراہی اور برے اعمال کی طرف لے جاتی ہے ،لہٰذا نیک افراد کی رفاقت اختیار کرنا دینی ودنیاوی دونوں لحاظ سے بہتر ہے، ایسی صحبت کی تاکید اور قرآن مجید میں بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یاأیھاالذین آمنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصادقین (توبہ: ۱۱۹) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

نیک صحبت سے انسان کا ایمان مضبوط ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ پر یقین وتوکل بڑھتا ہے اور دینی شعور پیدا ہوتا ہے، اللہ والے اچھے اخلاق کے عملی نمونہ ہوتے ہیں، ان کی صحبت سے انسان میں صبر، شکر، عاجزی، سچائی اور اخلاص جیسی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں، نیک صحبت میں وقت لگانے سے دل میں گناہوں سے نفرت اور نیکی کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے، انسان برے کاموں سے بچنے لگتا ہے۔

اللہ والوں کی صحبت دل کو اطمینان اور سکون عطا کرتی ہے، دل میں نیک کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور دل میں اللہ کی یاد بس جاتی ہے، ہر معاملہ میں اللہ پر اعتماد اور بھروسہ ہوتا ہے، ایسی صحبت انسان کو دنیا کی عارضی زندگی کی حقیقت سمجھاتی ہے اور آخرت کی تیاری کی طرف راغب کرتی ہے، نیک صحبت سے نماز، ذکر، تلاوت اور دیگر نیک اعمال کی پابندی آسان ہوجاتی ہے، اچھی صحبت انسان کو بری اور گمراہ کن صحبت سے بچاتی ہے، جو اخلاق اور ایمان دونوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

اللہ والوں سے محبت اور ان کی صحبت اختیار کرنا اللہ کی رضا کا ذریعہ بنتا ہے کیونکہ اللہ اپنے نیک بندوں سے محبت کرنے والوں سے بھی محبت فرماتا ہے، اس لئے ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اچھی اور صالح افراد کی صحبت اختیار کرے اور بری صحبت سے ہمیشہ اجتناب کرے۔

نیک صحبت سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، انسان کو پابندی سے عمل کرنے کی توفیق ملتی ہے، دل کے اندر آخرت کی فکر اور اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خوف پیدا ہوتا ہے، جو زندگی گزارنے کے لئے بہت اہم کڑی ہے، انسان کے دل میں گناہوں سے نفرت ہوجاتی ہے اور نیکی کرنے کو دل چاہتا ہے، انسان کے نفس اور اخلاق کردار کی اچھی طرح اصلاح ہوتی ہے، صاف ستھری زندگی گزارنا آسان ہوتا ہے، اپنی ذمہ داری بحسن خوبی ادائیگی کی فکر ہوتی ہے۔

حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ انسان اپنے نفس کی کمزوری کو خود پوری طرح نہیں پہنچان سکتا، اس لئے کامل اللہ والے کی صحبت دل کی بیماریوں (تکبر، حسد، ریا، غفلت) کے علاج کا سب سے مضبوط ذریعہ ہے، آپ فرماتے تھے نصیحت سے زیادہ صحبت کا اثر ہوتا ہے، جیسے خوشبو والے کے پاس بیٹھنے سے خوشبو حاصل ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھنے سے اللہ کی یاد، گناہوں سے نفرت، نیکی کی رغبت پیدا ہوتی ہے، صرف کتابیں پڑھ لینے اور تقریریں سن لینے سے کامل اصلاح نہیں ہوتی، جب تک کسی صاحب نسبت بزرگ کی صحبت نصیب نہ ہو، صحبت صالحین روحانی ترقی کی کنجی ہے، دل کی اصلاح کا سب سے محفوظ راستہ ہے، ایمان، عمل اور اخلاق تینوں کو سنوار دیتی ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی فکر اور تحریر کی روشنی میں اللہ والوں کی صحبت کا پختہ نظریہ تھا کہ انسان کی شخصیت، فکر اور عمل کی تشکیل میں صحبت کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے، حضرت مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان خواہ کتنا ہی علم رکھتا ہو اگر اسے نیک اور صالح لوگوں کی صحبت نصیب نہ ہو تو اس کے علم میں روح اور اثر باقی نہیں رہتی، وہ لکھتے ہیں کہ اخلاقی تربیت کتابوں سے کم اور صحبت سے زیادہ ہوتی ہے، اللہ والوں کی صحبت انسان کے اندر دین کی غیرت، امت کا درد اور اصلاح معاشرہ کا جذبہ پیدا کرتی ہے، اللہ والے صرف علم نہیں دیتے بلکہ عمل کی طرف لے جاتے ہیں، ان کی زندگی خود ایک دعوت ہوتی ہے، جسے دیکھ کر انسان دین کو عملاً اپنانے کی کوشش کرتا ہے

داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ محمد الحسنیؒ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اثر جس چیز کا ہوتا ہے وہ اس کی صحبت ہوتی ہے، اگر صحبت نیک ہو تو انسان نیک بن جاتا ہے اور اگر صحبت خراب ہو تو اچھی تربیت اور علم بھی ضائع ہوجاتا ہے۔

اللہ والوں کی صحبت دلوں کی اصلاح، ایمان کی مضبوطی اور اعمال کی درستگی کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

☆☆☆

فقہ اسلامی

میراث میں عورت کا حصہ مرد سے کم کیوں؟

منور سلطان ندوی (رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء)

میراث میں عورت کا حصہ مرد سے کم کیوں؟ یہ وہ سوال ہے جو اکثر غیر مسلم بھائیوں کی طرف سے، اور کبھی مسلم نوجوانوں کی طرف سے اٹھایا جاتا ہے، یہ سوال اس حوالے سے بظاہر مضبوط نظر آتا ہے کہ موجودہ وقت میں صنفی مساوات (gender equality) یعنی مرد وعورت کو یکساں درجہ دینے کو دنیا ایک مسلم اصول کی طرح مانتی ہے، پھر اسلام نے بھی بہت سے معاملات میں عورت ومرد کو یکساں مقام اور درجہ دیا ہے، اس تناظر میں یہ سوال اہم ہے کہ میراث کے مسئلہ میں مرد وعورت میں فرق کیوں؟ کیا یہ صنفی امتیاز نہیں ہے؟ اور کیا یہ عورت کی توہین ہے؟

اس سوال کو سمجھنے کے لئے قرآن، حدیث کے ساتھ اسلام کے خاندانی نظام اور ذمہ داریوں کی تقسیم کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔

اسلام عورت کا حقیقی محافظ

عورت کے حوالے سے آج کی متمدن دنیا کے اصول ونظریات کو سامنے رکھیں اور دوسری طرف اسلام میں عورت کے مقام ومرتبہ اور اس کی حیثیت سے متعلق تعلیمات کو سامنے رکھیں تو محسوس ہوگا کہ عورت کو جو مقام ومرتبہ اسلام میں حاصل ہے وہ کہیں اور نہیں، عورت کو جو وقار اور عزت یہاں حاصل ہے دوسرے مذاہب اور دوسرے ازموں اور تصورات میں اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے، اس بات کا اعتراف غیر مسلم محققین بھی کرتے رہے ہیں۔

معروف مغربی مؤرخ ولیم مونٹگمری واٹ لکھتے ہیں:

قبل از اسلام عرب میں عورت کا مقام بہت پست تھا..... اسلام نے اسے وراثت اور ملکیت کے حقوق دے کر اور مرد کے اختیارات کو محدود کر کے اس کی حالت بہتر بنائی۔

Muhammad at Medina)

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں ہے:

اسلام کے تحت عورت کو قانونی حیثیت دی گئی اور اسے وراثت اور جائیداد کے حقوق دیے گئے، جو بہت سے معاشروں میں اسے پہلے حاصل نہیں تھے۔

(Article: Women in Islam)

متمدن دنیا میں عورت کو مرد کے شانہ بہ شانہ کھڑا کرنے، انہیں آزادی اور خودمختاری دینے اور معاشرہ سے صنفی امتیاز کو ختم کرنے کے نام پر عورت کو جتنا ذلیل ورسوا کیا گیا وہ اہل علم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے، اس کے برعکس اسلام میں عورت کو ماں، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے جو بلند مقام عطا کیا اور اسلامی تعلیمات کے نتیجہ میں جو معاشرہ تشکیل پاتا ہے اس میں عورت کی عملی زندگی کتنی خوشگوار ہے وہ جگ ظاہر ہے، بطور نمونہ چند حوالے پیش ہیں:

مَن عَمِلَ صٰلِحًا مِّن ذَكَرٍ أَو أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤمِن فَلَنُحيِيَنَّهُۥ حَيوٰةً طَيِّبَةً وَلَنَجزِيَنَّهُم أَجرَهُم بِأَحسَنِ مَا كَانُوا يَعمَلُونَ۔ (نحل:۹۷)

مرد ہو یا عورت اگر مسلمان ہو تو جو بھی نیک عمل کرے گا ہم اس کی زندگی اچھی طرح بسر کرائیں گے، اور ہم ان کو اچھے کاموں کا اجر ضرور عطا فرمائیں گے۔

مرد وعورت دونوں میں جو بھی نیک اعمال کریں اجر کے مستحق ہوں گے:

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِينَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِينَ وَالصّٰدِقٰتِ---الخ (سورہ احزاب:۳۵)۔

(یقیناً مسلمان مردوں اور عورتوں، ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں، فرمانبردار مردوں اور عورتوں، سچے مردوں اور عورتوں، صبر کرنے والے مردوں اور عورتوں، اللہ سے ڈرنے والے مردوں اور عورتوں، صدقہ کرنے والے مردوں اور عورتوں، روزہ رکھنے والے مردوں اور عورتوں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مردوں اور عورتوں، اور اللہ کو خوب یاد رکھنے والے مردوں اور عورتوں کے لئے ہم نے بخشش اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کے بہتر ہونے کا معیار عورت کے ساتھ بہتر سلوک کو قرار دیا:

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، و خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِنِسَائِهِمْ۔ (ترمذی: ۲۶۱۱)

ایمان کے اعتبار سے کامل ترین مومن وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو، اور تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں (یعنی اپنی بیویوں) کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ

لِأَهْلِي (ترمذی: ۳۸۹۵)

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہو، اور میں تم سب میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں۔

اسلام نے سب سے پہلے عورت کو میراث میں حصہ دیا

میراث میں عورت کی حصہ داری پر بات کرتے وقت یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ جس مذہب پر انگلی اٹھانے کی کوشش جارہی ہے اسی نے سب سے پہلے عورت کو باضابطہ میراث میں حصہ دیا، یعنی اسلام نے ہی پہلی بار دنیا کو بتایا کہ عورت میراث کے معاملہ میں بھی مرد کی طرح ہے، اسے بھی میراث میں حصہ ملنا چاہئے، اسلام سے قبل میراث صرف مردوں کے لئے تھا، عورتوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ لڑنے کے قابل نہیں، خاندان کو تحفظ دینے کے لائق نہیں، تو پھر میراث کا حقدار کیوں کر ہوگی، تفسیر قرطبی میں ہے:

وَكَانُوا فِي الْجَاهِلِيَّةِ لَا يُوَرِّثُونَ النِّسَاءَ وَلَا الصَّغِيرَ وَإِنْ كَانَ ذَكَرًا، وَيَقُولُونَ: لَا يُعطَى إلا مَن قَاتَلَ عَلى ظُهُورِ الْخَيلِ، وَطَاعَنَ بِالرُّمحِ، وَضَارَبَ بِالسَّيفِ، وَحَازَ الْغَنِيمَةَ۔ (تفسیر قرطبی، ج۵، ص:۴۶)

اسلام نے عورت کو میراث میں حصہ دے کر عورت کی عزت اور اس کے وقار کا اعلان کیا، اور اس کی حیثیت کو مستحکم کیا، عورت کی آزادی اور خودمختاری کی اس سے بڑی اور مضبوط بنیاد دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔

دنیا سے جانے والا آدمی جو کچھ بھی چھوڑ کر جائے، اس کی ہر چیز میں اس کے وارثین مرد اور عورت دونوں کا حصہ ہے:

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا۔ (نساء:۷)

(والدین اور قرابت داروں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے، اور والدین اور قرابت داروں کے متروکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے، چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ مقرر کیا ہوا حصہ ہے)۔

عورت کو میراث میں حصہ دلانے سے متعلق اسلام کی اولیت کا اعتراف غیر مسلم مورخین اور دانشوروں نے بھی کی ہے، چند مثالیں ہیں:

مشہور مؤرخ J.M Roberts لکھتے ہیں:

اسلام کا ظہور کئی اعتبار سے انقلابی تھا۔ مثال کے طور پر اس نے عورتوں کو ایک درجہ میں مردوں سے کم رکھا، لیکن انہیں جائیداد کے بارے میں ایسے قانونی حقوق دیے جو یورپ کی عورتوں کو انیسویں صدی تک حاصل نہیں تھے۔

(The Pelican History of the World 334)

ریٹائرڈ چیف جسٹس دہلی ہائی کورٹ Rajinder Sachar نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تاریخی طور پر اسلام عورتوں کو جائیداد کے حقوق دینے کے معاملے میں بہت فراخ دل اور ترقی پسند رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو عورتوں کو 1956 تک جائیداد کے حقوق حاصل نہیں تھے، جب ہندو کوڈ بل پاس کیا گیا، جبکہ اسلام نے یہ حقوق مسلمان عورتوں کو چودہ سو سال پہلے ہی دے دیے تھے۔

(The Statesman:25/04/1986)

ہر حالت میں عورت کا حصہ کم نہیں ہوتا

اسلام نے تمام قریبی رشتہ داروں کو رشتہ کی قربت کے لحاظ سے نہ صرف میراث کا حقدار بنایا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر میراث کا مکمل نظام عطا کیا، اور یہ نظام اس ذات کی جانب سے ہے جس نے انسان کو پیدا کیا، اور جو انسان کی ضرورت اور مصلحت سے سب سے زیادہ واقف ہے۔

یہ سمجھا جانا کہ ہمیشہ اور ہر حال میں عورت کو مرد سے کم ملے گا، اسلامی نظام میراث سے عدم واقفیت کی دلیل ہے، بعض مواقع پر عورت کا حصہ مرد کے مقابلہ میں کم ضرور ہے، مگر متعدد حالتوں میں عورت کا حصہ مرد کے برابر اور بعض حالتوں میں اپنے مقابلہ مرد سے زیادہ ہے، اس کو درج ذیل مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے:

الف۔ ماں کو بعض حالتوں میں ایک تہائی حصہ ملتا ہے، جبکہ اس کے مقابل باپ کو چھٹا حصہ ملتا ہے، یہاں مرد کے مقابلہ میں عورت کو زیادہ مل رہا ہے۔

ب۔ باپ کا انتقال ہوا، اور اولاد میں صرف ایک لڑکی موجود ہے، تو وہ کل جائیداد کا نصف حصہ پائے گی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو مرد سے زیادہ بھی ملتا ہے۔

ج۔ بیٹے کا انتقال ہوا اور ماں اور باپ دونوں زندہ ہوں تو دونوں کو میراث کا چھٹا حصہ ملتا ہے، یہاں دونوں برابر ہیں۔

د۔ باپ کا انتقال ہوا، اور اولاد میں لڑکا اور لڑکی دونوں ہیں، تو ایسی صورت میں لڑکی کو لڑکے کا نصف حصہ ملتا ہے، یہاں دونوں میں فرق ہے۔

اس کی طرح بہت سی مثالیں جہاں عورت کبھی اپنے مقابل مرد کے برابر، کبھی اس سے زیادہ اور کبھی اس سے کم حصہ پاتی ہے۔

اسلام میں میراث کی بنیاد

سوال یہ ہے کہ اس فرق کی بنیاد کیا ہے؟ اسلام میں میراث کا نظام یکسانیت (equality) پر نہیں ہے، اسلام کا نظام میراث عدل (justice) پر قائم ہے، اس دنیا کا خالق بہتر جانتا ہے کہ مرد وعورت میں سے کس کو کس حالت کتنا ملنا چاہئے۔

اسلام میں میراث کے نظام میں مرنے والے کی خواہش یا وارثوں کی معاشی تنگدستی کو بنیاد نہیں بنایا ہے، بلکہ قربت یعنی مرنے والے سے کون وارث زیادہ قریب ہے، اس کو بنیاد بنایا گیا ہے، سورہ نساء میں جہاں میراث کا تفصیلی تذکرہ ہے، وہاں انسانوں کو مخاطب کرکے یہ بھی کہا گیا:

لَا تَدرُونَ أَيُّهُم أَقرَبُ لَكُم نَفعًا فَرِيضَةً مِّنَ ٱللَّهِ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا (نساء: ۱۱)۔

(تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے میں کن سے تم کو زیادہ نفع پہونچے گا، یہ حصے اللہ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے ہیں، بے شک اللہ خوب جاننے والے اور خوب دانا ہیں)۔

اسلام میں میراث کا نظام خاندانی نظام اور ذمہ داریوں سے مربوط ہے، فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: ''الغنم بالغرم'' یعنی جس پر ذمہ داری ہوگی اسی کو فائدہ بھی ملے گا، خاندان میں مرد وعورت میں سے جس کی جتنی زیادہ ذمہ داری ہوگی، وہ اتنا زیادہ میراث میں حصہ پائے گا۔

اسلام میں خاندان کے معاشی نظام میں مرد کو کفیل بنایا گیا ہے: الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ۔ (نساء: ۳۴)

یعنی خاندان کی کفالت کی ذمہ داری مرد پر رکھی گئی ہے، عورت پر نہیں، اسی لئے مالدار بیوی کا نفقہ بھی شوہر پر واجب ہوتا ہے، مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے والدین، اپنی اولاد اور قریبی رشتہ داروں کی معاشی ضرورت پورا کرے، یہ ذمہ داری عورت پر نہیں ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ میراث کے نظام کی بنیاد قرابت، ذمہ داری اور خاندانی نظام کے تحفظ پر ہے، اسی لئے ہر وارث کا حصہ الگ رکھا گیا ہے۔

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مرد ذمہ دار ہے، وہ خرچ بھی کرتا ہے، اور کفالت بھی کرتا ہے، اس کے برعکس عام حالات میں عورت پر دوسروں کی ذمہ داری تو دور، خود اپنی ذات کی ذمہ داری بھی اس پر نہیں ہے، لڑکی شادی تک والد کی کفالت میں رہے گی، شادی کے بعد شوہر کی کفالت میں، اور خدانخواستہ شوہر کا انتقال ہو جائے یا علاحدگی ہو جائے تو اپنے بچوں یا پھر والد یا چچا وغیرہ کی کفالت میں ہوگی۔

اس مسئلہ کو ایک دوسرے انداز سے بھی سمجھتے ہیں، لڑکا بالغ ہو جائے تو اس کی ذمہ داری اس کے والد پر نہیں ہوتی، بلکہ خود اسی پر ہوتی ہے، شادی کے بعد بیوی کا مہر اور اس کا نان ونفقہ مرد کے ذمہ لازم ہوتا ہے، بچہ ہو تو بچہ کی تمام ذمہ داری اسی مرد پر ہوتی ہے، یعنی بیوی کا خرچ، بچوں کا خرچ اور پورے گھر کا خرچ مرد پر ہوتا ہے، اس کے علاوہ اگر اس کے والدین زندہ ہیں اور ضرورت مند ہیں یا بھائی زندہ ہے اور ضرورت مند ہے، تو ان کی کفالت بھی اسی مرد کے ذمہ ہے، اس کے برعکس عورت پر عام حالات میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے، شادی کے بعد اسے مہر بھی ملے گا، نان ونفقہ کی بھی حقدار ہوگی۔

ایک عورت متعدد حیثیتوں سے میراث میں حصہ پاتی ہے، بیٹی ہونے کی حیثیت سے باپ کے میراث میں حصہ دار ہوتی ہے، بیوی ہونے کی حیثیت سے شوہر کے میراث کا حقدار بنتی ہے، اولاد کے انتقال پر بحیثیت ماں اور کبھی بحیثیت دادی اور نانی میراث میں حصہ پاتی ہے۔

اب میراث کے حصہ کو اور مرد وعورت کو ذمہ داریوں کا موازنہ کریں تو صاف نظر آئے گا کہ عورت پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اور وہ مختلف حیثیتوں سے میراث میں کبھی اپنے مقابل مرد سے زیادہ، کبھی مقابل مرد کے برابر اور کبھی مقابل مرد سے کم حصہ پاتی ہے، اس کے برعکس مرد پر اپنی، بیوی کی، بچوں کی، اور کبھی والدین یا دادا دادی کی کفالت لازم ہے، ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ میراث میں بعض حالات میں اپنے مقابل عورت کے برابر اور اکثر حالتوں میں اپنے مقابل عورت سے زیادہ پاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ میراث میں عورت میں حصہ کتنا ہو؟ یہ اسلام کے معاشی نظام اور خاندانی کفالت کے نظام کے ساتھ مربوط ہے، ذمہ داریوں کے تناسب سے اگر میراث میں حصہ داری کی بات کی جائے تو عورت بہر صورت نفع میں نظر آئے گی، عورت کو میراث میں حصہ دے کر اسلام نے عورت کے وقار میں اضافہ کیا، اس کی حیثیت کو مستحکم کیا، بعض حالتوں میں مرد کے مقابلہ میں کم حصہ پانا کسی بھی طرح عورت کی حیثیت کو کم نہیں کرتا۔

اسلام نے میراث کو صنفی امتیاز پر نہیں بلکہ خاندانی ذمہ داری، معاشی کفالت اور سماجی عدل کے اصول پر قائم کیا ہے، اسی لئے بعض حالتوں میں مرد کو زیادہ اور بعض حالتوں میں عورت کو زیادہ دیا گیا ہے، صحیح معنوں میں یہی حقیقی انصاف بھی ہے۔

☆☆☆

فتح مبین

یوم الفرقان: چند تربیتی پہلو

ڈاکٹر محمد فرمان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

لڑائیوں اور جنگوں کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ فاتح اور کشور کشا جنگوں کے ذریعہ ملکوں کو اپنی قلمرو میں شامل کرتے تھے، جن میں خون انسانیت کی ارزانی ہوتی تھی، اور اس کی ندیاں بہتی تھیں۔ بخت نصر کا حملہ ہو یا قسطنطین کا، زمانہ جاہلیت کی جنگیں ہوں یا دور حاضر کی عالمی جنگیں، ان میں جس طرح لوگوں کو تہہ تیغ کیا گیا، وہ عالم آشکارا ہے۔ صرف پہلی جنگ عظیم میں مرنے والوں کی تعداد ستر لاکھ سے زائد تھی، دوسری جنگ عظیم میں مرنے والوں کی تعداد ایک کروڑ تک پہنچتی ہے۔ ان کے علاوہ ان جنگوں کا کوئی اصول اور ضابطہ اخلاق نہیں تھا، بلکہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے الفاظ میں:

''بادشاہ اٹھتے تھے اور ملکوں کے ملکوں کا صفایا کر دیتے تھے، سکندر اٹھا اور جیسے کوئی کبڈی کھیلتا ہے ہندوستان تک چلا آیا، اور قوموں اور تہذیبوں کے چراغ گل کر دیئے، سیزر اٹھا اور انسانوں کا اس طرح شکار کھیلنا شروع کر دیا جیسے جنگی جانوروں کا شکار کھیلا جاتا ہے''۔ (نبی رحمت: ۴۱۸)

اسلامی جنگوں کے سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ مسلمانوں پر تھوپی گئی ہیں، پھر مسلمانوں نے اپنے دفاع کے لئے یہ جنگیں لڑی ہیں۔ غزوہ بدر کا پس منظر ہی یہی تھا کہ شام کی تجارت میں جو مال حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی سرکوبی کے لئے خرچ کیا جائے گا، اور غزوۂ احد تو خود مدینہ سے چند کیلو میٹر کے فاصلہ پر لڑا گیا۔ گویا دشمن سامنے آ گیا، غزوۂ خندق میں کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ اور قبائل عرب کا متحدہ محاذ اسلام کا چراغ گل کرنے لئے مدینہ پر حملہ آور ہوا۔ اسی طرح غزوہ بنی النضیر، غزوہ بنی قینقاع، غزوہ خیبر، غزوۂ حنین اور غزوۂ تبوک کی تفصیلات ہیں، جن میں دشمن نے پوری منصوبہ بندی سے مسلمانوں کو ختم کرنے کا نظام بنایا، پھر اس کا جواب دیا گیا۔

دنیاوی جنگوں اور غزوات رسول ﷺ میں نمایاں فرق یہ ہے کہ ان میں صرف دشمن کو نشانہ بنایا گیا۔ اور اسی کو تہہ تیغ کیا ہے، عورتوں، بچوں اور عبادت گاہوں اور دیگر مذہبی علامتوں سے تعرض نہیں کیا گیا، غزوات رسول ﷺ کا امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں فریقین کی طرف سے جو افراد کام آئے، ان کی تعداد ایک ہزار سے بھی کم ہے، جبکہ موجودہ زمانہ میں عام جنگوں میں اس سے زیادہ بڑی تعداد کام آجاتی ہے۔

غزوۂ بدر: پس منظر

کفار مکہ کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سلسلہ مسلمانوں کے مدینہ پہونچنے کے بعد بھی جاری رہا۔ وہ ہر لمحہ اسلام کو نقصان پہونچانے کی خفیہ پلاننگ کرتے تھے۔ اور اس کا صفایا کرنے کا نظام بناتے تھے، اسی وجہ سے آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو چوکنا رہنے کی تاکید کی تھی، صحابہ کرامؓ کے بارے میں مستدرک حاکم میں آیا ہے کہ: **کانوا لا یبیتون إلا بالسلاح، ولا یصبحون إلا فیه** (مستدرک حاکم: ۳۵۱۲) (وہ ہتھیار باندھ کر رات گذارتے اور اسی حالت میں صبح کرتے تھے)۔

اس خطرہ کو دور کرنے کی بہترین شکل یہ تھی کہ جب قریش تجارتی مقصد سے شام جائیں اور ان کی گذرگاہ مدینہ کے قریب تھی تو اس راستہ کو ان کے لئے تنگ کیا جائے، چنانچہ یہی ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ ابوسفیان کی قیادت میں شام سے قریش کا ایک تجارتی قافلہ جو چالیس آدمیوں پر مشتمل ہے واپس ہو رہا ہے۔

یہ سب اس لئے تھا کہ ان کی ظاہری شوکت ٹوٹ جائے، ابوسفیان کو جیسے ہی یہ اطلاع ملی تو قریش کو پیغام بھیجا کہ اس قافلہ کی مدد کریں، ورنہ پورا سرمایہ لٹ جائے گا، مکہ خبر پہنچتے ہی قریش نے ابوجہل کی قیادت میں ایک ہزار پر مشتمل ایک فوجی دستہ بھیجا، یہ فوجی دستہ ابھی راستہ ہی میں تھا کہ اس کو اطلاع ملی کہ ابوسفیان کا قافلہ سلامتی سے مکہ پہونچ گیا ہے۔ اور خطرہ سے نکل آیا ہے لیکن ابوجہل نے غرور و پندار میں کہا کہ بغیر جنگ کیے واپس نہیں جاسکتے۔

ابوسفیان کے قافلہ کے تعاقب کے لئے صحابہ کرامؓ کی جو جماعت تشکیل پائی تھی ان کی تعداد تین سو تیرہ تھی، حضور اکرم ﷺ کو معلوم ہوا کہ تجارتی قافلہ تو بچ بچا کر نکل گیا، لیکن ابوجہل کی قیادت میں ایک دوسرا قافلہ بدر کے میدان میں خیمہ زن ہے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ اور پوری صورت حال سے آگاہ کیا۔

واقعہ بدر سے پہلے رجب کے مہینہ میں رسول اللہ ﷺ نے قریش کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لئے حضرت عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ روانہ کیا تھا، ان کا سامنا قریش کے ایک قافلہ

سے ہوا، اور ٹکراؤ کی نوبت آئی۔ اس میں عمرو بن الحضرمی مارا گیا تھا، اس واقعہ کو قریش نے ایک بڑا مسئلہ بنایا، چونکہ رجب محترم مہینوں میں تھا اور اس میں قتل کا واقعہ پیش آیا تھا، اس قریش کو پروپیگنڈہ کرنے اور لوگوں کو مشتعل کرنے کا موقع مل گیا، اس پس منظر میں قریش کو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر آمادہ کیا گیا اور ابوجہل کی قیادت میں مدینہ کا رخ کیا گیا۔ (سیرت ابن ہشام ج۱/ ۶۰۱)

یوم الفرقان: ایک جائزہ

بدر کا علاقہ مدینہ سے ۸۰/ میل یعنی ۱۵۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر تھا۔ بدر کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ وہ ایک مشہور و معروف گاؤں تھا، جس کی نسبت بدر بن یخلد بن نضر بن کنانہ کی طرف تھی۔ دوسرے محققین نے کہا کہ: ایک کنویں کا نام ہے، اور کنویں کا پانی اتنا صاف وشفاف تھا، جیسے چودہویں رات کا چاند، اس لئے اس کو بدر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (الصادق الامین ص: ۸۲۹)

جمعہ کی رات تھی، رمضان کی ۱۷/ تاریخ، صبح نمودار ہوئی تو دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں اور صف آراء تھیں (زاد المعاد ج۱/ ۳۴۳)، یہ سنہ ۲ ہجری مطابق ۱۳/ مارچ ۶۲۵ء ہے، بعض اہل سیر نے ۱۲/ رمضان کی تاریخ ذکر کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے: اس جنگ کا آغاز ۱۲/ کو ہوا اور اختتام ۱۷/ رمضان کو ہوا۔

آپ ﷺ لشکر کے سامنے آئے اور مسلمانوں کو جہاد کا شوق دلایا، کفار کی طرف سے عتبہ، شیبہ اور ولید سامنے آئے، ان کے مقابلہ کے لئے انصار میں تین نوجوان (حضرت عوفؓ، حضرت معاذؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ) سامنے آئے تو کفار مکہ نے کہا کہ یہ ہمارے جوڑ کے نہیں ہیں، پھر مسلمانوں کی طرف سے مہاجرین میں سے عبیدہ بن الحارثؓ، حمزہؓ اور علیؓ نکلے تو انہوں نے کہا کہ یہ ہمارے برابر کی جوڑی ہے، سب سے پہلے حضرت عبیدہؓ نے عتبہ کو للکارا، حضرت حمزہؓ نے شیبہ کو، اور حضرت علیؓ نے ولید کو آواز دی، اور تینوں نے ان کافروں کا کام تمام کیا۔ اسی حملہ میں حضرت عبیدہ بن الحارثؓ شدید طور پر زخمی ہوئے، اور وہ بھی شہادت سے سرخرو ہوئے۔ (سیرت ابن ہشام ج۱/ ۶۲۵)

اسی جنگ میں ابوجہل کو قتل کیا گیا، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ میں معرکہ بدر میں اپنے دستہ میں تھا کہ اچانک دو کمسن نوجوان میرے دائیں اور میرے بائیں سے آئے اور کان میں پوچھا کہ ابوجہل کہاں ہے؟ میں نے پوچھا کہ تمہیں اس سے کیا مطلب؟ انہوں نے کہا کہ وہ جہاں کہیں ملے گا ہم اس کو ٹھکانے لگائیں گے، میں نے اشارہ کیا وہ دونوں عقاب کی طرح ابوجہل پر جھپٹے اور اس کو وہیں ڈھیر کر دیا، یہ دونوں معاذ بن عفراءؓ اور معوذ بن عفراءؓ تھے، جب ابوجہل مارا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس امت کا فرعون ابوجہل ہے۔ (سیرت ابن کثیر ج۲/ ۴۴۴)

فتح مبین اور اس کے اثرات

یہ جنگ مسلمانوں کے لئے فتح مبین یعنی کھلی ہوئی فتح ثابت ہوئی، اس میں چودہ صحابہ شہید ہوئے، قریش کے چھ اور انصار کے آٹھ افراد، لیکن کفار و مشرکین کے ستر (۷۰) سورما و سردار قتل کئے گئے اور ستر قید کئے گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اختتام جنگ میں فرمایا:

"اللہ أکبر، الحمد للہ الذی صدق وعدہ ونصر عبدہ، وھزم الأحزاب وحدہ۔"

(خدا کا شکر ہے، جس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندہ کی مدد فرمائی، اور تنہا ساری ٹولیوں اور گروہوں کو شکست دی)۔

کفار مقتولین کو ایک کنویں میں ڈال دیا گیا، اور قیدیوں کو مدینہ لایا گیا ہے، فتح کی خوشخبری دے کر رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن رواحہؓ کو پہلے مدینہ بھیج دیا تھا، گھر گھر میں خوشی اور جشن کا ماحول تھا۔ ادھر مشرکین مکہ کے گھروں میں رونا پیٹنا شروع ہو گیا تھا۔ اس جنگ کا اثر یہ ہوا کہ اسلام کا رعب لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا۔ اور مسلمانوں نے اطمینان کی سانس لی اور عزت وقوت محسوس کی، اسی کو قرآن کریم نے **"یوم الفرقان یوم التقی الجمعان"** (حق و باطل میں فیصلہ کا دن، جس میں دو لشکروں کی مڈبھیڑ ہوئی) کے لفظ سے ادا کیا ہے اور سچ ہے کہ یہ جنگ حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے والی جنگ ثابت ہوئی۔

مشرک قیدیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اچھا معاملہ کرنے پر زور دیا، اس سلسلہ میں صحابہ کرامؓ کا ایثار اور ان کے جذبۂ قربانی بہترین انداز میں قیدیوں کے سامنے آیا۔ ان قیدیوں میں عباس بن عبدالمطلب، عقیل بن ابی طالب، اور حضرت زینب بنت محمد ﷺ کے شوہر ابو العاص بن الربیع بھی تھے، لیکن ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا گیا۔ (نبی رحمت: ۱۹۷)

رسول اکرم ﷺ نے قیدیوں کے سلسلہ میں مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے، کچھ لوگوں کی رائے تھی، جن میں حضرت عمرؓ بھی تھے کہ ان کو تہہ تیغ کر دیا جائے۔ فیصلہ قرآنی بعد میں انہی کی رائے کے مطابق نازل ہوا۔ (الانفال ۶۷)

کچھ لوگوں کی رائے ہوئی کہ ان سے فدیہ لیا جائے اور چھوڑ دیا جائے۔ رسول اکرم ﷺ نے یہی رائے پسند کی۔ جن کے پاس فدیہ کی رقم نہیں تھی ان کے بارے میں یہ فیصلہ ہوا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں (مسند احمد ج۱/ص ۲۴۷)

اور ایک قیدی کے ذمہ دس مسلمان کی تعلیم ضروری تھی (طبقات ابن سعد ج ۲/ ۱۴) حضرت زید بن ثابت انہی صحابہ میں تھے، جنہوں نے اس نظام تعلیم سے علم حاصل کیا، اس طرح علم کی نشر واشاعت کا مہتم بالشان کام انجام پایا۔ (نبی رحمت: ۱۹۸)

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں: اسیران جنگ سے چار چار ہزار فدیہ لیا گیا، اور جو لوگ ناداری کی وجہ سے فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے وہ چھوڑ دیئے گئے ان میں سے جو لکھنا جانتے تھے ان کو حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں تو چھوڑ دیئے جائیں گے۔ (سیرت النبی ج ۱/ ۱۹۴)

یوم الفرقان: چند تربیتی پہلو

۱۔ یوم الفرقان رمضان کے مہینے میں پیش آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رمضان کا مہینہ صرف آرام و استراحت کا مہینہ نہیں، بلکہ غیر معمولی محنت و کوشش اور جہاد فی سبیل اللہ کا مہینہ ہے۔ اس مہینہ میں اس اہم واقعہ کے پیش آنے میں اللہ کی اس حکمت کا قوی امکان ہے کہ اس مہینہ کو راہ عزیمت اور قربانی کے ساتھ گذارا جائے۔

۲۔ اس واقعہ میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے اللہ پر بھروسہ کیا اور اسی کے سہارے یہ جنگ لڑی۔ حضور اکرم ﷺ کے یہ الفاظ گواہ ہیں: **اللھم إن تھلک ھذہ العصابۃ لن تعبد**، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جابجا توکل کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور توکل ظاہری تدبیر اختیار کر کے صرف اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنے کا نام ہے اور صحابہ کرامؓ نے اس میں توکل کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔

۳۔ جنگوں میں تعداد کی قلت و کثرت کا اعتبار نہیں، اصل مسئلہ ہے عزم و ارادہ کا۔ اگر انسان باعزم ہے اور دور اندیشی اس کی حلیف ہے تو کامیابی ضرور قدم چومے گی، اس واقعہ میں تعداد کے لحاظ سے دشمن کی فوجوں کا اسلامی فوج سے تین گنا فرق تھا، لیکن اللہ پر ایمان و یقین نے اس مسئلہ کو حل کر دیا۔ **کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ، واللہ مع الصابرین۔**

۴۔ ظاہری تدبیر بھی ضروری ہے، صرف دعا اور انابت ہی نجات کا ذریعہ نہیں، بلکہ توکل کا حقیقی مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے، یعنی دار الأسباب میں ہوتے ہوئے اسباب اختیار کر کے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا۔ بقول علامہ شبلی نعمانی: عالم اسباب کے لحاظ سے آپ نے اصول جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں۔ (سیرت النبی ج ۱/ ۱۸۸)

۵۔ اسلام کے دفاع کے لئے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ قافلہ ابوسفیان مکہ مکرمہ سے نکل چکا ہے اور اس کے مقاصد اچھے نہیں ہیں تو آپ ﷺ نے اس کے تعاقب کے لئے کچھ افراد بھیجے، لیکن وہ بچ بچا کر نکل گیا، پھر جب معلوم ہوا کہ واپس ہو رہا ہے تو آپ نے خود صحابہ کرامؓ کی جماعت کے ساتھ اس کے تعاقب کی فکر کی اور تشریف لے گئے۔

۶۔ علم حاصل کرنا ضروری ہے، اس سلسلہ میں کسی بھی فرد سے خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو اگر وہ واقف کار اور فن کار ہو تو علم حاصل کرنا ضروری ہے، بدر کے جو قیدی آئے تھے اور ان کو لکھنا پڑھنا آتا تھا تو ان کا فدیہ یہی تھا کہ وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔

۷۔ دعوتی جماعت کے تحفظ و بقا کی فکر کرنی چاہئے اور دعا بھی کرنا چاہئے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! اگر یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو روئے زمین پر تیری عبادت نہ ہو سکے گی۔

۸۔ عقیدے کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار رہنا چاہئے، اور اس کسی پس وپیش کا شکار نہیں ہونا چاہئے، بدر کا یہ معرکہ دو فریقوں کے درمیان معرکہ نہیں تھا، بلکہ عقیدہ کے تحفظ کا معرکہ تھا، بلکہ حق و باطل کی اولین جنگ تھی، جس میں مسلمان سرخرو ہوئے۔

۹۔ امیر کی اطاعت کسی بھی کام کے استحکام میں ایک بنیادی اہمیت رکھتی ہے، اس جنگ میں حضور اکرم ﷺ نے صحابہ سے جنگ کے سلسلہ میں مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ہم وہ نہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی بات نہیں مانی تھی، اگر حضور ﷺ ہم کو سمندر میں کودنے کے لئے فرمائیں گے تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

''معرکہ بدر تاریخ کا مشہور فیصلہ کن معرکہ ہے، جس کے سایہ میں ہم زندہ ہیں، ہماری حکومتیں، ہم میں مختلف رنگ و نسل کی مسلمان قومیں یہ سب بدر کی پروردہ ہیں، اور بدر اس دعوت و پیام کا رہین منت ہے، جسے آنحضرت ﷺ لائے تھے، اس لئے وہ چیز جس کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہے اور جس کے لئے ان کے اندر غیرت و حمیت ہونا چاہئے وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کے دین کا داعی و مبلغ سمجھیں، علم توحید کو سربلند اور اللہ کے دین کو سرسبز و شاداب رکھنے کی آرزو ان کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں پر غالب آجائے، آخرت کو دنیا پر ترجیح دیں، اللہ کی رضا اور اس کے احکام کے اجراء کو ہر مقصد اور ہر نسبت پر قربان کرنے کا جذبہ ان کے اندر بیدار کریں، ان کے بقا کی ضمانت اسی میں ہے،، کیوں کہ ان کا وجود ملی اسی دھاگے سے بندھا ہوا ہے''۔

(قرآنی افادات ج ۲/ ۲۹۵)

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

☆☆☆

روح پرور

اخلاص - دین کا جوہر اور کامیابی کی شاہ کلید

ڈاکٹر محمد اعظم ندوی (استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

یہ دنیا، جسے ہم بڑے شوق سے اپنے دلوں میں جگہ دیتے ہیں، آنکھوں میں سجاتے ہیں، سروں میں سودا بنا کر سماتے ہیں، اصل میں ایک دھندلا آئینہ ہے۔ اس آئینے میں چمکتی ہوئی چیزوں کا عکس تو نظر آجاتا ہے، مگر وہ شے گم ہو جاتی ہے جو بظاہر مدھم ہوتی ہے لیکن اندر سے اتنی ہی روشن۔ وہ شے جو انسان کے قلب کو جِلا بخشتی تھی، روح کو سکون دیتی تھی، اور اعمال کو وہ مقبولیت عطا کرتی تھی جو زمین کے کناروں سے آسمانوں تک کا سفر طے کرتی تھی وہ شے ''خلوص'' ہے، جو آج کے تیز رفتار دور کی بھیڑ میں کہیں کھو گئی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب خلوص ایک خوشبو کی مانند ہر عمل میں رچا بسا ہوا تھا، نیتیں بارش کے قطروں کی طرح شفاف اور بے رنگ تھیں۔ عمل کا مقصد اللہ کی رضا تھا، نہ کہ صرف لوگوں کی داد و تحسین۔ عبادتوں میں وہ سچائی تھی جو زمین پر قرار پاتی تھی اور آسمانوں کی طرف اڑان بھرتی تھی، مگر آج اسی خلوص کی راکھ کو شہرت اور نام و نمود کا طوفان اڑائے لیے پھرتا ہے اور انسان کو مقصد سے کہیں دور لے جا رہا ہے۔

دنیا کی ہر شے سے اگر اس کے اصل جوہر (essence) کو نکال دیا جائے تو وہ ڈھانچے اور تلچھٹ کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جیسے شہد سے مٹھاس اور پھول سے خوشبو۔ یہی حال خلوص کا ہے۔ یہ اعمال کی روح ہے جو انہیں معنی اور مقصد عطا کرتی ہے، لیکن آج یہ روح غائب ہے اور اس کی جگہ ریاکاری اور خودنمائی (ostentation) نے لے لی ہے:

بہت ہی کم نظر آیا مجھے اخلاص لوگوں میں
یہ دولت بٹ گئی شاید، بہت ہی خاص لوگوں میں

کسی تہذیب کے زوال کی پہلی علامت یہ ہے کہ انسان اپنی نیتوں کے ساتھ دھوکہ کرنے لگے۔ کچھ ایسا ہی آج ہو رہا ہے۔ دینی کوششیں، جو کبھی تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہوا کرتی تھیں، اب اسٹیج کی مصنوعی روشنی سے چمک پانے کو بے تاب رہتی ہیں۔ وہ خطبات، جو قلوب کو گرماتے تھے، اب اکثر سوشل میڈیا کے ویوز بڑھانے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

مطاف، مقامِ ابراہیم اور صفا و مروہ پر ہر مقدس جگہ ''لائیو'' ہونے کا شوق بڑھتا جا رہا ہے۔ آج ہم سادگی اور اخلاص سے کوسوں دور ہیں۔ اجتماعی دعاؤں میں بہ تکلف رونے اور آہ و زاری کا اہتمام معمول بن چکا ہے۔ یہ جذبات اکثر خشوع کے بجائے دکھاوے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

"كان الرجل تأتيه عبرته فيسترها، فإذا خشي أن تسبقه قام من المجلس"۔

(جب کسی شخص کو رونا آتا تو وہ اسے چھپاتا، اور اگر اسے اندیشہ ہوتا کہ آنسو بہہ پڑیں گے تو وہ مجلس سے اٹھ کر چلا جاتا)۔

یہ قول اس دور کی روحانی عظمت کی عکاسی کرتا ہے جب عبادات اور قلبی کیفیات کو خالصتاً اللہ کے لیے محفوظ رکھا جاتا تھا۔

خشیت کی حلاوت اخفا میں پوشیدہ ہے۔ دل کی رقت آمیز کیفیت کا گواہ صرف اللہ ہو، نہ کہ لوگوں کی نظروں کا ہجوم۔ یاد رکھنے کا سبق یہ ہے کہ عمل کی مقبولیت کا راز ''سیلفی'' میں نہیں بلکہ ''سیلف لیسنس'' (selflessness) یعنی بے نیازی اور بے لوث عبادت میں ہے۔

یہی چیز انسان کو خوئے دلنوازی اور شانِ دلآویزی عطا کرتی ہے اور زمستانی ہواؤں میں بھی اسے آہِ سحرگاہی کے لیے بیدار کر دیتی ہے، قیام و قعود اور رکوع و سجود کی بے پناہ لذتوں سے سرشار کر دیتی ہے۔

خلوص کی اصل طاقت وہ سچائی ہے جو انسان کے دل سے نکلتی ہے اور عمل کو ہر زاویے سے روشن کر دیتی ہے۔ یہ ایک درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتی ہیں اور جس کا پھل ہر عمل میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

اخلاص وہ جوہرِ حیات ہے جس پر بندگی کی بنیاد قائم ہے۔ یہ قلب کی وہ کیفیت ہے جو عمل کو معراج اور نقطۂ کمال (pinnacle) عطا کرتی ہے اور اللہ کی بارگاہ میں مقبول بناتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ''۔ [البینہ: ۵]

یہ اخلاص ہی ہے جو نیت کو پاکیزہ اور شفاف بناتا ہے اور بظاہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی عظیم بنا دیتا ہے۔

آیئے ہم اس چراغ کو دوبارہ جلائیں، سورۂ اخلاص کو وردِ زباں اور معانیِ اخلاص کو حرزِ جاں بنائیں، اپنی نیتوں کو خالص کریں اور اپنے اعمال کو اس معیار پر لے جائیں جو اللہ کو مطلوب و محبوب ہے۔

اقبالؒ نے سچ کہا ہے:

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعوائے نظر لاف و گزاف

☆☆☆

یقین کامل

دعا-بندگی کا سرِّ نہاں

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

ایک انسان جب اس کائنات میں آنکھیں کھولتا ہے تو وہ اپنی کمزوری، محتاجی اور بے بسی کے احساس کے ساتھ اس فانی زندگی کا آغاز کرتا ہے، یہی احساس اسے اپنے خالق ومالک کی طرف متوجہ کرتا ہے، اور اسی رجوع کا سب سے خوبصورت، اثر انگیز اور بابرکت ذریعہ ''دعا'' ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''الدعاء مخّ العبادة'' یعنی دعا عبادت کا مغز (جوہر) ہے۔

دعا دراصل ایک بندہ کا اپنے رب کے سامنے جھک جانا، اپنی عاجزی کا اعتراف کرنا اور اپنی جملہ ضروریات کو اسی کی بارگاہ میں پیش کرنا ہے، دعا محض الفاظ کا مجموعہ نہیں؛ بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی وہ صدا ہے جو عرشِ الٰہی تک پہنچتی ہے، قرآن مجید انبیاء کی دعاؤں سے بھرا ہوا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ دعا ہر دور میں اہلِ ایمان کا سب سے بڑا سہارا رہی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ'' (تمہارا رب کہتا ہے: مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا)۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سنتا ہے اور انہیں عطا بھی فرماتا ہے؛ لیکن بندہ مانگے تو سہی، اپنے دامن کو خدا کے آگے پھیلائے تو سہی، لاتعداد لوگوں سے ناشکری کے کلمات سنے، کہتے ہیں کہ ہماری وہ نہیں سنتا، ایسے ایسے جملے سننے کو ملتے ہیں کہ بندہ حیران رہ جاتا ہے، یاد رہے کہ دعا کے تین پہلو ہوتے ہیں، یا تو قبول ہوجاتی ہے، یا آخرت کے لیے ذخیرہ کرلی جاتی ہے، یا مصیبت کو ٹال دیتی ہے مگر رد نہیں ہوتی۔ دعا سراسر عبادت ہی عبادت ہے، دعا اظہارِ بندگی ہے، دعا عبادات کا مغز ہے، دعا انبیاء کی سنت ہے، دعا مومن کا ہتھیار ہے، دعائیں تقدیریں بدل دیتی ہیں، دعا دین کا ستون، دعا آسمان وزمین کا نور ہے، یہ ایک فطری عمل ہے کہ مومن خوشحالی میں بارگاہِ الٰہی میں سجدۂ شکر پیش کرتا ہے اور پریشانی میں بھی سب سے پہلے اپنے اللہ ہی کو یاد کرتا ہے، اس سے ہم کلام ہوتا ہے، گڑگڑاتا ہے، روتا ہے اور اسے ایسے منالیتا ہے جیسے ایک ننھا بچہ اپنی ماں سے کوئی اپنی ضرورت منوالیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کے ساتھ ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ سے (دعا) نہیں مانگتا اللہ اس سے ناراض ہوتا ہے''۔ [جامع ترمذی]۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ کوئی چیز مکرم نہیں۔ [سنن ابن ماجہ] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ عظمت والا کوئی عمل نہیں۔ [جامع ترمذی] آپ ﷺ نے فرمایا: وہ چیزیں جو مرنے کے بعد میت سے منقطع نہیں ہوتیں، ان میں ایک دعا بھی ہے، فرمایا: قضا کو کوئی چیز نہیں ٹال سکتی سوائے دعا کے۔ [جامع ترمذی]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تقدیر کو دعا ہی ٹال سکتی ہے اور نیک اعمال سے ہی عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ [جامع ترمذی]

ویسے تو دعا کسی بھی وقت مانگی جاسکتی ہے؛ البتہ احادیث کی روشنی میں چند اوقات کو اہمیت حاصل ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بندہ سجدہ کی حالت میں اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، لہٰذا سجدوں میں کثرت سے دعا کیا کرو۔ [صحیح مسلم] ایک اور حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے رکوع اور سجدہ میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، لہٰذا رکوع میں اپنے رب کی کبریائی اور عظمت بیان کرو اور سجدوں میں کثرت سے دعائیں کرو، کیوں کہ سجدوں کی حالت میں کی جانے والی دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔ [صحیح مسلم]

اذان اور اقامت صلوٰۃ کے درمیان کا وقت قبولیتِ دعا کا خاص اور موزوں وقت ہے، اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعائیں ضرور قبول فرماتا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اذان اور اقامت کے درمیانی وقت میں کی جانے والی دعا رد نہیں کی جاتی۔ [جامع ترمذی]

جمعہ کے دن میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی گھڑی رکھی ہے جس میں کی جانے والی کوئی بھی دعا قبولیت سے سرفراز ضرور ہوا کرتی ہے، اس گھڑی میں کی جانے والی دعا رد نہیں کی جاتی۔ [بخاری ومسلم]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے جمعہ کے دن کے فضائل کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: جمعہ کے دن میں ایک ایسی ساعت اور ایک ایسا لمحہ ہے کہ جس بندہ کی دعا اس لمحہ سے ٹکرائی یعنی اس گھڑی میں جس بندے کی زبان سے دعا نکلی، اللہ تعالیٰ اسے ضرور شرفِ قبولیت سے نوازتا ہے۔

وہ ساعت ہمایوں کون سی ہے؟ اس سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہے، سب سے زیادہ صحیح بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ وہ ساعت جمعہ کے دن عصر کے بعد ہوتی ہے اور اس کی دلیل ابو داؤد کی وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جمعہ کے دن کی گھڑیوں میں ایک گھڑی ایسی ہے جس میں بندہ اللہ سے جو کچھ مانگتا ہے پالیتا ہے، اسے عصر کے بعد والی گھڑی میں تلاش کرو۔

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں رسول ﷺ نے فرمایا، تین (آدمیوں) کی دعا قبول کی جاتی ہے جس میں کوئی شک نہیں۔

۱۔مظلوم کی دعا، ۲۔مسافر کی دعا، ۳۔والد کی دعا اپنے بیٹے کے حق میں۔[سنن ابن ماجہ]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: بہت جلد قبول ہونے والی دعا وہ ہے جو غائبانہ طور پر اپنے کسی مسلمان بھائی کے لئے کی جائے۔[سنن ابوداؤد]

آج کا انسان مادی ترقی کے باوجود بے چینی، اضطراب اور ذہنی و قلبی پریشانی کا شکار ہے، جدید سہولیات نے آرام تو دیا، مگر دل کا سکون چھین لیا، ایسے حالات میں دعا ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو انسان کو حقیقی سکون اور قلبی اطمینان فراہم کرتا ہے، جب انسان دنیا کے سہاروں سے مایوس ہو جاتا ہے تو دعا اسے ایک نئی امید، نئی طاقت اور نیا حوصلہ دیتی ہے۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم دعا کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنائیں، ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی سے رجوع کریں، اور یقین رکھیں کہ وہی ذات ہماری ہر صدا سننے والی اور ہر مشکل حل کرنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص کے ساتھ دعا کرنے اور اس کی قدر پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

سیرت طیبہ کے سلسلۃ الذہب کا نیا شاہکار

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمۃ للعالمین

تالیف: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ العالی

عہد حاضر میں محدثین ہند کی عظیم الشان روایات کے وارث و امین حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی دامت برکاتہم کی تصنیفی و تالیفی زندگی کی حاصل، سرور دو عالم ﷺ کی سیرت پاک سے روشنی اور رہنمائی کے لیے موجودہ عہد کے تقاضوں اور جدید انسانی معاشرہ و مزاج کی مناسبت سے حضور پاک ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کی دلنشیں، دلنواز اور دلکش تشریح علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی ﷺ کے سو سال بعد سیرت نگاری میں مجددانہ کارنامہ تین ضخیم جلدوں میں خیر و برکت کی حامل یہ سیرت مصطفی عرب و عجم کے اہل نظر کی داد و تحسین کے مطابق:

۱ حضور ﷺ کی ذات اور سیرت پر لکھنے کا مطلب ہے کہ حرمین شریفین پر بھی قلم اٹھایا جائے، یہ وہ نکتہ ہے جسے ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے اس کتاب میں خاص طور پر ملحوظ رکھا۔
محمد رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین (ڈاکٹر شیخ عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی-سابق جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ)

۲ یہ سیرت پاک کے موضوع پر گراں قدر تصنیف ہے، میں اس کو شیخ ندوی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی اور فضل ربانی سمجھتا ہوں۔ (ڈاکٹر سعود بن ابراہیم الشریم-امام و خطیب مسجد حرام مکۃ المکرمہ)

۳ یہ جامع انسائیکلوپیڈیا ہے، مشرق و مغرب میں پوری امت اسلامیہ کے لیے گراں قدر تحفہ ہے۔
(ڈاکٹر ابو لبابہ طاہر صالح حسین)

۴ یہ عظیم الشان کتاب جامعیت اور دلکشی میں بے مثال اور عظیم شاہکار ہے اور ایسی کتاب ہے جس میں افراط و تفریط دونوں انتہاؤں سے بچ کر اعتدال کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، زبان عصر حاضر کے فہم کے مطابق ہے۔
(ڈاکٹر موفق بن عبداللہ-استاذ حدیث جامعہ ام القریٰ)

۵ بنیادی خوبی یہ ہے کہ سیرت نبوی پر لکھنے کے لیے جن باتوں کا علم ضروری ہے اس میں صاحب کتاب کمال مہارت کے حامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ایمان و عقیدہ کو مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ (مولانا سید محمد رابع ندوی)

دیدہ زیب کتابت، بہتر مجلد خوبصورت سرورق کے ساتھ تین جلدوں کا مکمل سیٹ حاصل کرنے کے لیے جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ یوپی اور دیوبند اور ندوہ کے مشہور مکتبوں سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

پتہ **جامعہ بُکڈپو** جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ یوپی
موبائل نمبر: 9450876465 9532829745
قیمت: 2000 خصوصی رعایت کے ساتھ قیمت: 750

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

نام کتاب: **درسِ اسلام**
از: حافظ کرناٹکی

'درسِ اسلام' محترم جناب حافظ کرناٹکی صاحب کے دینی مضامین کا مجموعہ ہے، جو روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کے جمعہ ایڈیشن میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ سیرت، سوانح، توحید وعبادت کے چند مضامین کے علاوہ باقی مضامین کا تعلق اسلامی فکر اور اسلامی زندگی اور اخلاقیات سے ہے۔ یہ کل اٹھارہ بیس مضامین ہیں جو شستہ اور سلیس زبان اور دلنشین اسلوبِ بیان میں تحریر کیے گئے ہیں۔

حافظ صاحب موصوف بنیادی طور پر ایک کہنہ مشق اردو زبان کے شاعر ہیں، اور انھوں نے کثرت سے اشعار کہے ہیں۔ اسی کتاب کے آخر میں ان کی تحریر وتصنیف کی جو فہرست درج کی گئی ہے اس میں ان کے صرف شعری مجموعوں کی تعداد ۶۱ تک جا پہونچتی ہے، جب کہ نثری تصنیفات کا عدد ۵۴ مذکور ہے۔ اس طویل فہرست کو دیکھ کر جہاں ایک طرف بے ساختہ زبان پر کلمۂ 'سبحان اللہ' جاری ہوتا ہے، وہیں دل میں یہ جذبۂ رشک بھی پیدا ہوتا ہے کہ قدرت کسی کو کسی چیز سے نوازنے پر آئے تو کتنا کچھ عطا کرتی ہے۔ یقیناً یہ فہرست اور یہ اعداد ان کے مطالعہ کی وسعت، فکری زرخیزی، جولانیٔ طبع اور تحریری قوت کا پتہ دیتے ہیں۔

موصوف محترم اصلاً شعر وادب اور تاریخ کے حوالہ سے لکھتے رہے ہیں، ان کی تصانیف کی فہرست میں مذکور عناوین ہمیں یہی بتاتے ہیں؛ لیکن پھر شاید ادبی صلاحیت پر طبیعت کی صالحیت غالب آ گئی، اور انھوں نے خالص دینی موضوعات کے لیے بھی وقت نکالنا شروع کیا، اور خامہ فرسائی کے اس میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ ابتدائی مضامین میں عشقِ رسول اور محبتِ رسول ﷺ کا ذکر ہوا تو اس برکتوں کا ظہور لازمی تھا، پھر پے درپے ''موت سے کس کو دستکاری ہے''، ''توحید''، ''حضرت خواجہ معین الدین چشتی''، ''وحی، حکمِ الٰہی اور ہماری زندگی''، ''اللہ کے محبوب بندے''، ''دین، اخلاق اور شرافت''، ''خودفراموشی وخدا فراموشی اور حقوق اللہ''، ''اللہ سے سرکشی کا انجام''، ''سچ اور خوب تر کی جستجو''، ''شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ''، ''فضیلتِ صیام''، ''شکر گذاری وحق پرستی''، ''ہمدردی وایثار اور باہمی امداد''، ''اخلاق اور اخلاقی قوت''، ''خدمتِ خلق، حسنِ سلوک اور فرائض کی انجام دہی''، ''خوش کلامی، حلم اور شرم وحیا'' جیسے موضوعات زیرِ قلم آتے چلے گئے، اور ڈھائی سو صفحات کا ایک قابلِ قدر مجموعہ تیار ہو گیا جس کو بجا طور پر 'درسِ اسلام' کا نام دیا گیا۔

گرچہ 'درسِ اسلام' کے مضامین عام دینی موضوعات پر ہیں، اور ان موضوعات پر مستقل لکھا جاتا رہا ہے؛ لیکن حافظ صاحب موصوف کا قلم بڑا البیلا ہے، اور کچھ الگ ہی رنگ رکھتا ہے۔ کچھ انھوں نے یہ جدت بھی اختیار کی ہے کئی موضوعات کو ایک ربط کے ساتھ متحد کر دیا ہے، جیسے مذکورہ بالا عناوین میں آخری عنوان، اور جیسے ''وحی، حکمِ الٰہی، اور ہماری زندگی''، ''دین، اخلاق اور شرافت''، ''خودفراموشی وخدا فراموشی اور حقوق اللہ''۔ عام طور پر ''خودفراموشی و خدا فراموشی'' ایک الگ موضوع تصور کیا جاتا ہے، اور ''حقوق اللہ'' اس سے جدا موضوع، اور دونوں پر الگ الگ قاری کو بے شمار مضامین مل جائیں گے؛ لیکن یہاں اک ربطِ باہم پیدا کر کے موضوع میں جدت پیدا کر دی گئی ہے، اور یہی وہ خوبی ہے جس کو ان مضامین کی روح اور مابہ الامتیاز شی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس ربط کو جاننے اور سمجھنے اور اس کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔

ان مضامین کے استناد کے لیے کافی ہے کہ ہر دعوی کی بنیاد قرآنی آیات، احادیثِ نبویہ اور خاص طور پر عہدِ نبوی وعہدِ صحابہؓ کے واقعات پر رکھی گئی ہے، گرچہ حوالوں کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے جو قاری کے لیے مزید اطمینان کا باعث ہوتا۔ امید کرتے ہیں آئندہ ایڈیشن میں اس کا بھی اہتمام کر لیا جائے گا۔

ہم امید کرتے ہیں یہ مجموعۂ مضامین مقبول ہوگا اور لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

''ایجوکیشنل پبلیکیشنز ہاؤس، نئی دہلی'' نے شائع کیا ہے، مجوزہ قیمت ۴۰۰/ روپیہ ہے۔ حیدرآباد، ممبئی، لکھنؤ، سری نگر، جموں کلکتہ، مئوناتھ بھنجن، علی گڑھ، الٰہ آباد، پٹنہ، اورنگ آباد اور مظہرہ کے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔

☆☆☆

ایک جائزہ

فکری غلامی کے بڑھتے سائے

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عالمی افق پر بدلتی ہوئی سیاسی بساط اور مشرق وسطیٰ میں بڑھتی ہوئی کشیدگی نے پوری دنیا کو ایک نئے اضطراب سے دوچار کر رکھا ہے۔ یہ کشمکش محض علاقائی تنازع نہیں بلکہ عالمی طاقت کے توازن، سیاسی بالادستی اور نظریاتی غلبہ کی ایک گہری علامت ہے۔

اس صورت حال میں ترقی پذیر ممالک ایک مشکل دوراہے پر کھڑے ہیں۔ انہیں فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اپنی خارجہ پالیسی میں خودمختاری برقرار رکھیں یا عالمی طاقتوں کے دباؤ میں آکر اپنی راہ تبدیل کر دیں۔ اس کشمکش میں ہندوستان کی پالیسی کا کردار خاص طور پر اہم ہے۔

آج ہندوستان کی خارجہ پالیسی اور داخلی سیاست دونوں بتدریج عالمی طاقتوں کے سامنے سپر ڈالتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آزادی کے بعد جو ملک اپنی پالیسیوں میں خودمختار تھا، اس پر ایک نئی قسم کی غلامی کا سایہ تیزی سے پھیل رہا ہے۔ یہ غلامی طوق وسلاسل کی نہیں بلکہ افکار، نظریات، سیاسی ترجیحات اور عالمی پالیسیوں کی غلامی ہے۔ جب کسی ملک کی داخلی اور خارجی سیاست کی سمتیں بیرونی طاقتیں طے کرنے لگیں تو وہ آزادی اور ترقی کے نام پر درحقیقت غلامی کی طرف پیش قدمی کر رہا ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان نے جس خارجہ پالیسی کی بنیاد رکھی تھی، وہ خودمختاری، طاقت کے توازن اور عدم وابستگی کے بلند اصولوں پر قائم تھی۔ آزادی کے بعد اختیار کی گئی یہ حکمت عملی محض سفارتی تدبیر نہیں تھی بلکہ ایک فکری و تہذیبی موقف تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک نئی آزاد قوم کسی بھی عالمی بلاک کی تابع داری اختیار نہ کرے، بلکہ اپنے قومی مفادات، تہذیبی شناخت اور اخلاقی اقدار کی روشنی میں اپنا راستہ خود طے کرے۔ مگر موجودہ سیاسی منظرنامہ اس روایت سے واضح انحراف کر رہا ہے اور ایک نئی نوع کی فکری وابستگی کو جنم دے رہا ہے۔

آج ہندوستان کی خارجہ پالیسی محض سفارتی ضرورت یا قومی سلامتی تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے اثرات کروڑوں کی آبادی پر پڑ رہے ہیں۔ امریکہ کے ساتھ بڑھتی قربت کو ترقی، جدیدیت اور سلامتی کے دلکش نعروں سے سجایا جاتا ہے، مگر اس کے دوررس مضمرات پر سنجیدہ فکری مکالمہ نہیں ہوتا، دفاعی معاہدے اور اسٹریٹجک اتحاد توازن کے بجائے ایک خاص سمت میں جھکاؤ کو ظاہر کرتی ہیں، جو طویل مدت میں خودمختاری اور فکری آزادی کو کمزور کر سکتی ہیں۔

یاد رہے کہ کسی بھی قوم کی بقا اور مضبوطی کی بنیاد اس کی خودمختاری اور فکری آزادی ہے۔ اگر یہ متاثر ہو جائے تو نہ تو ملک حقیقی ترقی کر سکتا ہے اور نہ ہی قوم آزاد رہ سکتی ہے۔

اسی تسلسل میں ایک اور نازک پہلو مسلم عوام کے فکری رویوں میں نمایاں ہو رہا ہے۔ حالیہ عالمی کشمکش کے تناظر میں بعض حلقوں میں ایک ایسی مرعوبیت جنم لے رہی ہے جو سنجیدہ فکری تجزیے کے بجائے جذباتی وابستگی پر مبنی ہے۔ بعض علاقائی طاقتوں یا گروہوں کا مغربی قوتوں کے مقابلے میں مزاحمتی رویہ بظاہر دلکش لگتا ہے، مگر اسی بنیاد پر بلا امتیاز ان کی تائید یا ان کے فکری و مذہبی ماڈل کو اختیار کرنے کی دعوت ایک خطرناک رجحان بن سکتا ہے۔

اہل سنت کی اپنی ایک مضبوط علمی، فقہی اور اعتقادی روایت ہے، جو صدیوں کے اجتہاد، اعتدال اور توازن کا نتیجہ ہے۔ اس روایت کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے مکتب فکر سے مرعوب ہو جانا دراصل اپنی مذہبی خودمختاری اور فکری آزادی سے دست برداری کے مترادف ہے۔

یاد رہے! سیاسی اتحاد اور مذہبی ہم آہنگی دو الگ دائرے ہیں۔ وقتی طور پر سیاسی مفادات کے تحت کسی گروہ کی حمایت ایک بات ہے، مگر اس کے فکری و مذہبی تصورات کو بلا تنقید قبول کر لینا بالکل مختلف معاملہ ہے۔ اگر یہ حد مٹ جائے تو فکری انتشار پیدا ہوتا ہے اور امت کے اندر اعتدال کی جگہ مسلکی انتہا پسندی اور مذہبی مرعوبیت رجحان پروان چڑھتا ہے۔

اہل سنت نے ہمیشہ توازن، اعتدال اور علمی دیانت کو مقدم رکھا۔ نہ وہ کسی سیاسی طاقت سے مرعوب ہوئے اور نہ اپنے مذہبی اصولوں پر سمجھوتہ کیا۔

آج بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ حالات کا تجزیہ جذبات کے بجائے علم، بصیرت اور اصولی موقف کی روشنی میں کیا جائے۔ کسی بھی ملک یا گروہ کی حمایت یا مخالفت کا معیار صرف عدل، حق اور امت کے وسیع تر مفادات ہونے چاہیں، نہ کہ وقتی جذبات یا سیاسی نعروں کی گونج!

☆☆☆

فقہی مسائل

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

سوال: ایک شخص کے رمضان المبارک کے کئی روزے چھوٹ گئے تھے، اب ان کی ادائیگی کب ہوگی؟ کیا چھوٹے ہوئے روزے ایک ساتھ متواتر رکھنا ضروری ہے یا فصل کے ساتھ بھی رکھ سکتے ہیں؟ کیا شوال ہی میں رکھنا ہے یا کچھ فاصلہ کے ساتھ رکھنے کی گنجائش ہے؟

جواب: بعد رمضان جب عید الفطر گذر جائے تب بسہولت قضاء روزے رکھ سکتے ہیں، شوال ہی میں رکھنا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی ایک ساتھ متواتر رکھنا ضروری ہے جبکہ فصل کے ساتھ بھی رکھنے کی گنجائش ہے۔

[الجامع لأحکام القرآن: ۲/۲۶۳]

سوال: ایک شخص نے رمضان کا روزہ رکھا اور نفس پر قابو نہیں رکھ سکا، بیوی سے تعلق قائم کرلیا تو کیا اس صورت میں ساٹھ روزے رکھنے ہوں گے، اب اگر روزہ رکھنے کے بجائے ساٹھ مسکینوں کے کھانے کی رقم کسی مسکین کو دیدی جائے تو اس سے کفارہ ادا ہو جائے گا؟ یا ساٹھ مسکینوں کو ہی الگ الگ طور پر کھانے کی رقم دینی ہوگی؟

جواب: رمضان میں روزہ رکھ کر بلا عذر روزہ توڑ دینے کے کفارہ لازم ہو جاتا ہے، کفارہ میں مسلسل ساٹھ روزے رکھنے پڑتے ہیں یا ساٹھ الگ الگ مسکینوں کو یا ایک ہی کو ساٹھ دن کھانا کھلانا پڑتا ہے، یا ساٹھ مسکینوں کو کھانے کی رقم دی جائے گی، ایک ہی مسکین کو ساٹھ مسکینوں کی رقم دیدینا کافی نہیں ہے، اور اگر ایک ہی کو دینا ہے تو ساٹھ دن تک الگ الگ دن میں رقم دی جائے گی، ایک ہی دن میں ساٹھ الگ الگ مسکینوں کو کھانے کی رقم دیدی جائے تو اس سے کفارہ ادا ہو جائے گا۔

[الدر المختار مع رد المحتار: ۵/۱۴۳-۱۴۵]

سوال: ایک شخص نے زندگی میں بہت سے روزے توڑ دیئے پھر توبہ کرلی اور کفارہ کے ساتھ روزے رکھ لئے، اب سوال ہے کہ یہ کفارہ تمام توڑے ہوئے روزوں کا ہوگا یا صرف ایک رمضان کے توڑے ہوئے روزوں کا؟ اگر سب کا کفارہ نہیں ہوا تو اب کیا کرنا ہوگا؟

جواب: یہ مسئلہ قدرے تفصیل طلب ہے جو درج ذیل ہے: اگر کسی نے رمضان کا روزہ کھایا پی کر توڑا ہے تو ایک ہی کفارہ اسکے تمام روزوں کے لئے کافی ہوگا، خواہ کئی رمضان میں روزے توڑے گئے ہوں، البتہ اس میں ایک شرط یہ ہے کہ پہلے کفارہ ادا نہ کیا ہو تو بعد میں ایک ہی کفارہ سب کفاروں کے لئے کافی ہو جائے گا۔

اور اگر کسی نے رمضان کا روزہ جماع (بیوی سے تعلق قائم کرکے) توڑا ہے تو اس صورت میں ہر رمضان کے توڑے ہوئے روزوں کا ایک کفارہ لازم ہوگا، اس طریقہ سے توڑے تمام رمضان کے روزوں کے لئے مطلق ایک کفارہ کافی نہیں ہوگا، اور جب کفارہ ادا کرلیا اور اس کے بعد پھر کوئی اس طرح کا عمل کرلیا تو پھر الگ سے نیا کفارہ لازم ہوگا، اس میں یہ بھی صراحت ضروری ہے کہ خواہ اس نے کھا پی کر روزہ توڑا ہو یا بیوی سے تعلق قائم کرکے توڑا ہو۔

[الدر المختار مع رد المحتار: ۳/۳۹۱]

سوال: اگر کوئی حاملہ عورت کمزوری اور جسم میں بلڈ کی کمی کی وجہ سے ڈاکٹر کی ہدایت پر روزہ نہیں رکھ سکی تو اسکی قضاء کی کیا صورت ہوگی؟ کیا فدیہ دیدینے سے قضا ساقط ہو جائے گی؟

جواب: حاملہ عورت کے لئے، اسی طرح دودھ پلانے والی عورت کے لئے جبکہ روزہ رکھنے سے بچہ کو دودھ نہ مل سکے، رمضان کا روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے، لیکن بعد میں جب سہولت ہو، ان روزوں کی قضاء لازم ہے، فدیہ کافی نہیں ہے۔

[رد المحتار علی الدر المختار: ۳/۴۰۵]

سوال: اگر کوئی حاملہ عورت میں رمضان میں روزہ نہیں رکھ سکی تو بعد میں کیا وہ صرف قضاء کرے گی یا کفارہ بھی لازم ہوگا؟

جواب: فقہاء نے صراحت کی ہے کہ حاملہ عورت کے لئے رمضان کے روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے، اس لئے کفارہ لازم نہ ہوگا، البتہ یہ رخصت اندیشۂ ضرر کی بنا پر ہے خواہ جنین کو ضرر ہو یا خود حاملہ کو۔

[فتاویٰ تاتارخانیہ: ۳/۴۰۴]

سوال: ایک عورت نے رمضان میں روزہ رکھا تھا، لیکن آدھے دن گزرنے کے بعد وہ ناپاکی کی حالت میں آگئی، اس نے شام تک روزہ رکھا، کچھ کھائی پی نہیں، تو کیا یہ روزہ شمار ہوگا یا نہیں؟ کیا قضاء کرنی پڑے گی؟

جواب: ناپاکی شروع ہوتے ہی اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا اور بعد میں قضاء لازم ہوگی، البتہ ایسی عورت کے لئے یہ گنجائش ہوتی ہے کہ وہ کھا پی سکتی ہے، شام تک اس کے لئے روزہ داروں کی طرح رہنا ضروری نہیں ہے۔

[طحطاوی علی مراقی الفلاح: ص ۳۷۰-۳۷۱]

☆☆☆

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہٖ تعالیٰ

تاریخ ۱۰/اپریل ۲۰۲۶ء

Date 10th April 2026

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دینِ حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات و عطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91-8736833376

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا